اصغر ندیم سیّد کے کرداروں کا مطالعہ: نفسیات اور عائلی زندگی کے تناظر میں

(خدا زمین سے گیا نہیں ہے، تم ہو کہ چپ، بول میری مچھلی، دل تو بھٹکے گا کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔ فل (اُردو)

مقالہ نگار

صبا وحید

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مئی، سنہ ۲۰۱۹

اصغر ندیم سیّد کے کرداروں کا مطالعہ: نفسیات اور عائلی زندگی کے تناظر میں

(خدا زمین سے گیا نہیں ہے، تم ہو کہ چپ، بول میری مچھلی، دل تو بھٹکے گا کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار

صبا وحید

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مئی، ۲۰۱۹ء

©صبا وحید

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف ہائیر لینگو ئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **اصغر ندیم سیّد کے کرداروں کا مطالعہ: نفسیات اور عائلی زندگی کے تناظر میں**
(خدا زمین سے گیا نہیں ہے، تم ہو کہ چپ، بول میری مچھلی، دل تو بھٹکے گا کے حوالے سے)

پیش کار: صبا وحید رجسٹریشن نمبر: 1324/M/U/S17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اردو

ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان (نگران مقالہ) _____

ڈاکٹر نازیہ یونس (شریک نگران مقالہ) _____

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____
ڈین فیکلٹی آف لینگو ئجز

بریگیڈئر محمد ابراہیم _____
ڈائریکٹر جنرل

_____

تاریخ

اقرارنامہ

میں صبا وحید اقرار کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے، اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان اور ڈاکٹر نازیہ یونس کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لئے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

مقالہ نگار

صبا وحید

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرستِ ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کی منظوری اور دفاع کا فارم	**iii**
اقرار نامہ	iv
فہرستِ ابواب	v
Abstract	ix
اظہارِ تشکر	xi
باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	**۱**
الف) تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیانِ مسئلہ	۱
iii. مقاصدِ تحقیق	۲
iv. تحقیقی سوالات	۲
v. تحقیقی کا طریقہ کار	۲
vi. مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	۲
vii. تحدید	۲
viii. پسِ منظری مطالعہ	۳
ix. نظری دائرہ کار	۳
x. تحقیق کی اہمیت	۴
ب) اصغر ندیم سید کا تعارف و شخصیت	۴
ج) اردو ڈرامے کا آغاز و ارتقا	۱۲
د) اردو ڈرامے کا آغاز و ارتقا	۱۹

ہ) پاکستانی ڈراما نفسیات اور عائلی زندگی کے تناظر میں ۲۳
-حوالہ جات ۳۲
باب دوم: اصغر ندیم سید کے منتخب ڈراموں کا تعارفی خاکہ اور موضوعاتی مطالعہ ۳۴
حصہ اوّل ۳۴
اصغر ندیم سید کے ڈراموں کا تعارفی خاکہ
حصہ دوم: ۴۲
اصغر ندیم سید کے ڈراموں کا موضوعاتی ۴۲
الف) جاگیر درانہ رسم ورواج ۴۳
ب) دہشت گردی کا موضوع ۵۲
ج) غربت وافلاس ۵۷
د) خواتین کے مسائل ۶۱
-حوالہ جات ۶۷
باب سوم: اصغر ندیم سیّد کے کرداروں کا نفسیات کے تناظر میں مطالعہ ۶۹
الف۔ کرداروں کی نفسیات ۶۹
ب) کردار نگاری ۷۴
ج) مردانہ کرداروں کا نفسیات کے تناظر میں مطالعہ ۷۶
د) خواتین کرداروں کا نفسیات کے تناظر میں مطالعہ ۱۰۰
-حوالہ جات ۱۲۳
باب چہارم: اصغر ندیم سید کے کرداروں میں عائلی زندگی ایک مطالعہ ۱۲۸
الف) عائلی زندگی ۱۲۸
ب) منتخب ڈراموں میں عائلی زندگی ایک مطالعہ ۱۳۲
-حوالہ جات ۱۶۷
باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج، سفارشات ۱۷۰

الف) مجموعی جائزہ ۱۷۰
ب) نتائج ۱۸۱
ج) سفارشات ۱۸۱
کتابیات **۱۸۲**

ABSTRACT

Literature is a pleasure for life. Life and human being have been the subject of every aspect of life while, in literature man and society appears to be like blood stream. Characters evolve from values, customs, different mental level, Psychology, and the thoughts of family life. From these characters the society reforms or demolishes. Characters are the most important in the literature.

In my thesis I research about the family life and psychological point of view, and I have chosen considerably this topic. Asghar Nadeem Sayeed is personality who has good abilities ideas thoughts. His dramas reflect life point of view and mental remedies towards it. In my thesis the basic question about the research is that how character, their mental point of view and family life are important? What are the topics of their dramas? What is their intellectual point of view towards life?

Asghar Nadeem Sayed in his dramas depicts norms and customs, social issues and psychological problem of men and women. He brings forward the intellectual ideological and emotional states .in his dramas he shows true picture of the modern man whereas on the other hand he also depicts true picture of the society he is lagging behind from the values of ethical and religion peoples forward the mental state and domestic life of a man. On one side he advices the young girl to learn the moral lesson of the life on the same time also advice the man to move the right path. Through his dramas he shows social issues.

There is different topic in my selected dramas Asghar Nadeem Sayed appears as the most disciplined personality who look into his intellectual emotional esoteric from the same point of view. he advises the girls courageously and face the challenges and problem he looked into character from all the aspects for him the characters anxiety and emotional background is important. This is a reason his character is more interesting and important for analyzing due to this reason and aspect I have research on his characters.

My script consists of five chapters. Chapter one: in chapter one it consists of three parts included - introduction of my thesis - introduction of chosen personality “Asghar Nadeem Sayed” and - introduction of Pakistani drama.

chapter two consists of two parts one contains the brief summary about of the selected dramas and second part consists on themes of the dramas this part is divided into four sub parts names as: feudal system, terrorism, poverty, women problem.

In third chapter character are psychologically studied they are divided into three parts. part one is introduction of psychology. part two - character sketches third one critical and psychological analysis of men and women characters.

In the fourth Chapter contains two parts: in part one I discuss the personal family life then in second part I critically analyzed the characters family life.

Fifth chapter consists overviews results and orders.

اظہارِ تشکر

ڈراموں کو لکھنا ان کے کرداروں کا تجزیہ کرنا مشکل تو تھا مگر وہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک کا چاہنا ہو جانا ہے۔ میرا رب اگر نہ چاہتا تو کچھ بھی ممکن نہ تھا میرے رب نے مجھے حوصلہ دیا، ہمت دی اور مجھے اس قابل بنایا کہ میں یہ کام مکمل کر سکو۔ میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں کہ اس کے سہارے میں یہاں تک آ پہنچی ہوں۔

میں اپنے اہل خانہ کی بھی شکر گزار ہوں کہ اگر ان کی کا ساتھ نہ ہوتا تو میں کبھی بھی مکمل توجہ تحقیق پر نہ دے سکتی تھی۔ اگر مجھے مقالے کا انتساب کسی کے نام کرنے کی اجازت دی جاتی تو میں انتساب اس ہستی کے نام کرتی جس کے حصے کا وقت میں نے اپنی تحقیق کو دیا، میری والدہ! جن کی دعاؤں کی بدولت میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ اپنی استاد ڈاکٹر نازیہ یونس اور ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان کی بھی احسان مند ہو۔ انہوں نے مقالے کے ابتدائی مراحل سے لے کر مکمل ہونے تک میری ذہنی تربیت کی میرے اساتذہ کی فکری رہنمائی نے مقالے کے دوران پیش آنے والی دشواریوں کو آسان بنا دیا۔ میں اپنے شعبہ اردو کی تمام سٹاف کی بے حد شکر گزار ہوں خاص طور پر ڈاکٹر عابد سیال صاحب جنہوں نے مجھے اپنے تعاون سے نوازا۔ دوست احباب کی پر خلوص دعاؤں کا شکریہ جو دوران تحقیق میرے ساتھ رہی۔

مقالہ نگار

صبا وحید

باب اول:

موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف

ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں ڈراما ایک ایسی صنف اور تخلیقی عمل ہے جس کا عوام اور افراد کے ساتھ براہِ راست اور فوری نوعیت کا تعلق ہے۔ ڈراما کسی بھی ردِ عمل کے لیے انتظار کا محتاج نہیں۔ ڈرامے میں ردِ عمل کی حیثیت اجتماعیت کی حامل ہوتی ہے۔ اسی لیے ڈراما انسان اور معاشرے پر فوری اثر انداز ہو کر کامیابی اور ناکامی کی صورت میں ردِ عمل ظاہر کر دیتا ہے۔

اس ردِ عمل کے لیے کردار اور الفاظ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اردو میں متعدد لکھاریوں نے ڈرامہ نگاری کی صنف میں طبع آزمائی کی۔ تاریخ میں ایسے بہت سے ڈراما نگار گزرے ہیں جن کا نام ادب کے میدان میں آج بھی زندہ ہے۔ ایسے ہی ایک ڈراما نگار اصغر ندیم سید ہیں۔ آپ کالم نگار، شاعر اور استاد ہیں۔ نیز ایک ہمہ جہت علمی اور ادبی شخصیت ہیں۔ آپ نے ادب کے حوالے سے گراں قدر خدمات سر انجام دی ہیں مگر آپ کو زیادہ شہرت ڈراموں کے باعث حاصل ہوئی۔ میں نے ان کی ڈراما نگاری کے فن کو سامنے رکھتے ہوئے تحقیقی کام کا آغاز کیا تھا تاکہ ان کے ڈراموں کے کرداروں کا نفسیاتی اور عائلی زندگی کے تناظر میں تجزیہ کر سکوں۔

ii۔ بیانِ مسئلہ:

اس دورِ جدید میں ڈراما سماجی تبدیلی، ذہن سازی اور افکار کی ترسیل کا بہترین ذریعہ ہے۔ ڈراما نگاری ایک قدیم فن ہے اور انسانی زندگی کا واضح عکس پیش کرتا ہے۔ ڈراما نگاری کے فن میں وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ جدت آتی چلی گئی۔ اسی جدت کی بنا پر ڈراما آج انسانی معاشرے پر حکمرانی کر رہا ہے۔

اصغر ندیم سید نے کئی ڈرامے لکھے۔ ان کے ڈرامے ادب میں اور عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ ان کے ڈراموں میں کرداروں کا ایک انوکھا جہاں آباد ہے۔ اسی باعث زیرِ نظر تحقیقی موضوع میں منتخب ڈراموں کے کرداروں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ نیز کرداروں کی نفسیاتی اور عائلی زندگی کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان منتخب ڈراموں کے موضوعات کا بھی تجزیہ پیش کیا گیا۔

iii۔ مقاصدِ تحقیق:

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

۱۔ اصغر ندیم سیّد کے منتخب ڈراموں کا موضوعاتی مطالعہ کرنا۔

۲۔ اصغر ندیم سیّد کے منتخب ڈراموں کے کرداروں کا عائلی زندگی کے تناظر میں مطالعہ کرنا۔

۳۔ اصغر ندیم سیّد کے منتخب ڈراموں کے کرداروں کا نفسیاتی تناظر میں مطالعہ کرنا۔

iv۔ تحقیقی سوالات:

۱. موضوعاتی سطح پر اصغر ندیم سیّد کے ڈراموں کی نوعیت کیا ہے؟

۲. اصغر ندیم سید کے ڈراموں میں کس نوعیت کے نفسیاتی کردار موجود ہیں؟

۳. اصغر ندیم سیّد کے ڈراموں میں عائلی زندگی کی پیشکش کس قسم کی ہے؟

v۔ تحقیق کا طریقہ کار:

مجوزہ تحقیقی کام میں مشاہداتی اور دستاویزی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ جس میں بنیادی اور ثانوی مآخذات سے مدد لی گئی ۔ دوران تحقیق اصغر ندیم سیّد سے ملاقات کی گئی اور انٹرویو بھی کیا گیا۔ اس کے علاوہ کتب خانوں سے شواہد اکھٹے کیے گئے ہیں۔

vi۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

اس سے قبل مشہور ڈراما نگاروں پر مختلف یونیورسٹیوں میں سندی مقالات لکھے گئے۔ اصغر ندیم سید پر "ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد"، "جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد"، "لاہور کالج ویمن، لاہور"، "پوسٹ گریجویٹ کالج، باغبان پورہ، لاہور" اور بہاولپور یونیورسٹی، بہاولپور" میں کام ہو چکا ہے۔ اس سے قبل ان کے PTV کے ڈراموں پہ کام ہوا ہے۔ مگر اس نوعیت کا تحقیقی کام ابھی تک سامنے نہیں آیا۔

vii۔ تحدید:

مجوزہ تحقیقی کام اصغر ندیم سید کے کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ (منتخب ڈراموں کے حوالے سے) ہے۔ یہ منتخب ڈرامے "جیو ٹی وی" اور "پی ٹی وی" پہ نشر ہو چکے ہیں۔ ڈراموں کے کرداروں کا تجزیہ نفسیات کے علاوہ عائلی زندگی کے تناظر میں کیا گیا ہے۔

Viii۔ پس منظری مطالعہ:

اصغر ندیم سید کے منتخب ڈراموں کا گہرا مشاہداتی مطالعہ کیا گیا۔

منتخب ڈرامے درج ذیل ہیں:

- خدا زمیں سے گیا نہیں ہے
- بول میری مچھلی
- تم ہو کہ چپ
- دل تو بھٹکے گا

علاوہ ازیں اصغر ندیم سید سے انٹرویو لیا گیا۔

ix۔ نظری دائرہ کار:

اس مقالے کی مدد سے جہاں پاکستانی ڈرامے کے تعارف اور ارتقا کا جائزہ لیا جائے گا وہیں اصغر ندیم سید کے ڈراموں کے موضوعاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ کرداروں کا نفسیاتی و عائلی زندگی کے تناظر میں تجزیہ کیا جائے گا۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:

مجوزہ تحقیق اصغر ندیم سید کے ڈراموں کے کرداروں کا نفسیاتی اور عائلی زندگی کے تناظر میں مطالعہ ہے۔(منتخب ڈراموں کے حوالے سے) ادب کے کرداروں کو نفسیات کے حوالے سے جانچنا نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں ان کے کرداروں کا نفسیاتی حوالے سے تجزیہ کیا گیا اور ان کے کرداروں کو عائلی زندگی کے تناظر میں بھی پرکھا گیا ہے۔ ان کے ڈراموں کے کرداروں کی ذہنیت، سوچ، رویوں کے ساتھ ساتھ معاشرے میں ان کے اثرات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

ب: اصغر ندیم سیّد بحیثیت ڈراما نگار:

گزشتہ نصف صدی سے اردو دنیا کے افق پر چھائی رہنے والی شخصیات میں سے ایک نام اصغر ندیم سیّد کا بھی ہے۔ اصغر ندیم سیّد ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ آپ اردو ادب کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب ڈرامہ نگار ، صحافی ، شاعر ، افسانہ نگار اور ناول نگار بھی ہیں۔ اصغر ندیم سیّد کی علمی وادبی کارگزاریاں کم وبیش تیس سالوں پر محیط ہیں، لیکن ادب میں جس شعبے سے ان کی شناخت قائم ہوئی وہ ڈراما نگاری ہے۔

اصغر ندیم سیّد اعلیٰ تخلیقی ذہن کے مالک ہیں۔ ڈراما نگاری کے علاوہ انہوں نے دیگر اصنافِ نثر میں بھی طبع آزمائی کی۔ انہوں نے، شاعری، افسانے اور ناول نگاری کی طرف بھی توجہ دی لیکن بطور خاص ان کی دلچسپی کا محور و مرکز ڈراما رہا۔ تخلیقی ادب میں جو کامیابی ان کو ڈرامے کے ذریعے ملی وہ کسی اور صنف سے نہ مل سکی۔

ڈرامے کے احیا میں اصغر ندیم سیّد نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ انھوں نے ایک ایسے وقت ڈرامے کی طرف توجہ کی جب کتابوں کی زینت بن جانے سے اس کا دائرہ کار تبدیل ہو رہا تھا۔ ایسے میں اصغر ندیم سیّد نے اردو ڈرامے کو عوام کے قریب لانے اور ڈرامے کی اہمیت وافادیت اجاگر کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں وہ خاطر خواہ کامیاب بھی ہوئے۔

اصغر ندیم سیّد ۱۴ مئی ۱۹۴۹ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد غلام اکبر شاہ کا تعلق بہاولپور سے ، جبکہ والدہ کا تعلق ملتان سے تھا۔ ان کا خاندانی نام "غلام اصغر ندیم سیّد سبز واری" ہے۔ "اصغر ندیم سیّد" بطور قلمی نام بی۔ اے کے بعد اپنایا۔ دوست احباب "شاہ جی" جب کہ گھر والے "اصغر" کہتے ہیں۔ وہ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں یوں بتاتے ہیں۔

"میرے خاندان کا تعلق حضرت شاہ شمس سبز واریؒ کے خاندان سے بتایا جاتا ہے۔ میرے دادا کہتے ہیں کہ ہم ایران سے آکر یہاں ریاست بہاول پور کے گاؤں میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے کچھ رشتے دار مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔ والد صاحب آٹھ جماعتوں کی تعلیم پا سکے، اور پھر ملتان کے خاکوانی خاندان کے پانچ بھائیوں کی زمینوں کے مختار مقرر ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہم پانچ بہن بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم تک پڑھایا ہے۔۔۔ والد صاحب کا تعلق ریاست بہاولپور کے علاقے چاچڑاں شریف اور حجہ عباسیاں کے بیچ ایک بستی سے تھا۔ وہ کئی میل دور جا کر ایک بستی میں پڑھتے تھے۔ یہ علاقہ کھجوروں اور آم کے باغات کے لیے مشہور ہے۔ جبکہ میری والدہ کا تعلق ملتان سے تھا اس لیے میرے والد صاحب ملتان آ گئے۔ ان دونوں جگہوں سے ہمارا رشتہ قائم ہے۔ میرے ڈرامے "دریا" اور "پیاس" دونوں میں یہ علاقے کسی نہ کسی شکل میں دکھائی دے جاتے ہیں۔۔۔۔"(۱)

ان کی پہلی بیوی فرزانہ ندیم سیّد کی بے وقت موت نے ان پر بہت برا اثر ڈالا۔ اس حادثے کے بعد وہ بالکل ٹوٹ گئے تھے۔ ان کی اولاد میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ بیٹا عدیل انجنیئر ہے اور دبئی میں پراجیکٹ مینیجر کے طور پر کام کر رہا ہے۔ ایک بیٹی ماہم نے ایم۔بی۔ اے کیا ہے جب کہ دوسری بیٹی فاطمہ نے انگریزی اور سائیکالوجی پڑھی ہے۔ اصغر ندیم سید کا کہنا ہے کہ فاطمہ میری ادبی وراثت کی امین ہو گی۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد انہوں نے دوسری شادی کی جو کامیاب رہی۔ شیبا عالم بھی اردو ادب کی استاد ہیں۔

اصغر ندیم سید نے ملازمت کا آغاز ۱۹۷۲ء میں بطور لیکچرار کیا۔ وہ اردو کے علاوہ انگریزی، پنجابی، سندھی اور سرائیکی زبانیں بھی جانتے ہیں۔ ان کے بہت سے ڈراموں میں پاکستان کی علاقائی زبانوں کے مکالمے موجود ہیں جن میں "دریا"، "پیاس"، "خواہش"، "نجات"، "چاند گرہن" اہم ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے کالج میں کچھ اساتذہ سے متاثر ہو کر شاعری کا آغاز کیا۔ ان کے اساتذہ میں سجاد حیدر، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر اے بی اشرف، عرش صدیقی، فرخ ددرانی، اسلم انصاری، اقبال شاہ، تاج محمد جیسی شخصیات ملتی ہیں۔ ان کے لیے ان کے استاد مثالی شخصیات ہیں، وہ ان جیسا ہی بننا چاہتے ہیں۔ دورِ طالبِ علمی سے ہی انہوں نے ادیب، شاعر اور استاد بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کی پسندیدہ ادبی شخصیات میں "فیض احمد فیض"، "منیر نیازی"، "ن۔م راشد"، "مجید امجد"، "سبطِ حسن"، "گوپی چند نارنگ"، "ظہیر کاشمیری"، "انتظار حسین"، "صفدر میرا" اور "سیّد فیض الرحمان" شامل ہیں ان کا کہنا ہے: "یہ شخصیات زندگی کے ترقی پسندانہ شعور اور انسانی قدروں کی حفاظت کرتی تھیں۔"(۲)

انہوں نے اپنے اساتذہ کرام سے متاثر ہو کر شعبہ تدریس کا انتخاب کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے حادثاتی طور پر نہیں بلکہ اپنی خوشی سے اس پیشے کو اپنایا ہے۔ وہ ۱۹۷۲ء میں شعبہ تدریس سے وابستہ ہوئے اور آج بھی اسی پیشے سے منسلک ہیں۔ وہ اپنی اس حیثیت پر بہت فخر کرتے ہیں۔ ان کو اس شعبے سے وابستہ ہوئے تقریباً ۳۶ سال سے زائد کا عرصہ ہو گیا ہے۔ ۳۶ سالوں میں سے وہ ۲۲ سال گورنمنٹ کالج "جی۔سی یونیورسٹی لاہور"، ایک سال "فارمین کرسٹن کالج لاہور"، ۳ سال گورنمنٹ کالج ملتان سے منسلک رہے۔ وہ اسکول کے دور سے ہی شاعری اور بزمِ ادب میں حصہ لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ لاہور کے حلقہ اربابِ ذوق سے منسلک ہو گئے۔ وہ ۱۹۸۴ء۔۱۹۸۳ء میں حلقہ اربابِ ذوق کے سیکرٹری بھی منتخب ہوئے۔

۱۹۷۲ء میں ان کی پہلی غزل رسالہ "فنون" میں چھپی۔ اس کے بعد "اوراق"، "سیپ" وغیرہ میں ان کی شاعری چھپتی رہی۔ ان کے نظریات ترقی پسندانہ ہیں۔ وہ ملک میں مارشل لا کے خلاف ہیں۔ اس مخالفت کی وجہ سے ان کو کئی بار عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ وہ ملتان میں ۱۹۷۴ء میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ انہوں نے زمانہ طالبِ علمی میں "سعادت حسن منٹو" کا افسانوی مجموعہ "خالی بوتلیں خالی ڈبے" پڑھ لیا تھا۔ جس کے بعد

ان کو محسوس ہوا کہ انسان کو لکھنا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ لکھنا ہی انسان کی آزادی ہے اور میں اب تک اس آزادی کے راستے پر چل رہا ہوں۔ کسی محقق نے جب ان کی زندگی کے ابتدائی ایام کے حوالے سے سوال کیا تو ان کا کہنا تھا کہ میں نے عام زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ مجھ میں لکھنے کی جرأت آگئی۔

بقول اصغر ندیم سیّد:

> "ابتدائی ایام میں زندگی کئی طرح سے ملی۔ کھیلوں میں دلچسپی فطری بات تھی۔ مگر کھیل بھی عام لوگوں کے پتنگ بازی، لٹّو گھمانا، پٹھو گرم، چھپن چھپائی، گلی ڈنڈا، پکڑ پکڑائی، کوکلا چھپاکی، بنٹے کھیلنا، جی بھر کے کھیل کھیلے، جی بھر کے فلمیں سینما میں جا کے دیکھیں۔ جی بھر کے ہوٹلوں، خوانچوں اور گلی محلے کے پھیری والوں سے کھانے کی اشیا کھائیں، جی بھر کر شہر میں گھومے پھرے۔ شاید یہی وہ باتیں تھیں جنہوں نے زندگی کے قریب کر دیا اور مطالعے نے یہ جرأت پیدا کی کہ مجھے بھی لکھنا چاہیے۔"(۳)

انہوں نے باضابطہ طور پر ۱۹۸۰ء میں ڈرامہ نگاری کا آغاز کیا اور سب سے پہلا ڈراما چودہ اگست کے موضوع پر لکھا۔ وہ ڈراموں میں ملک کے سماجی، معاشرتی و سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے "کنور آفتاب" کی فرمائش پر ڈرامے لکھنے کا آغاز کیا۔ کنور آفتاب نے ان کی نظم سنی تو ان سے ڈراما لکھنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے "صبح کی دستک" کے نام سے ڈراما لکھا۔ یوں اصغر ندیم سیّد کی ڈراما نگاری کا آغاز ہوا۔ ۸۰ء اور ۹۰ء کی دہائی میں ان کے ڈراموں کو بہت شہرت ملی۔ مسلسل دس سال تک ان کو بہترین ڈراما رائٹر کا ایوارڈ ملتا رہا۔ ان کا کہنا ہے کہ:

> "ٹی وی اور فلم عوام تک پہنچنے کا ایک بڑا اور وسیع میڈیم ہے۔ لہٰذا میں نے اپنی تخلیقی صلاحیتیں اس شعبے کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ دور تھا جب ٹی وی پر پڑھے لکھے پروڈیوسروں کی حکومت ہوتی تھی۔ میں نے ۱۹۸۰ء میں پہلا ڈراما ٹی وی کے لیے لکھا یہ چودہ اگست کے حوالے سے خصوصی کھیل تھا۔ صبح کی دستک"۔۔۔۔۔(۴)

اصغر ندیم سیّد نے جب ڈرامہ نگاری کی طرف توجہ کی تو ان کے پیش نظر اس وقت کا پُر آشوب ماحول، بنتے بگڑتے تہذیبی ڈھانچے، سماج میں پھیلی ہوئی برائیاں اور تاریخی حوالے تھے۔ اصغر ندیم سیّد نے سماجی، سیاسی، تاریخی اور عصری مطالبات سے اپنے ڈراموں کا تانا بانا تیار کیا اور ٹی وی ڈرامے کی تکنیک کا لحاظ رکھتے ہوئے کامیاب ڈرامے تخلیق کیے ہیں، جو ان کے فکر و فن کا نمونہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

> "افسانہ، ڈراما، ناول تنقید یہ سب میرے اظہار کا میڈیم ہے۔ ان سب میں اپنے تجربات و مشاہدات کو تخلیقی مزاج سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہر میڈیم اپنی جگہ اہم ہوتا ہے، اور اظہار کے لیے اس میں گنجائش ہوتی ہے۔ ایک لکھنے والے کو اپنے جذبات اور فکر کو بہتر پیرائے میں ادا کرنے کے لیے کسی نہ کسی میڈیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اسے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو وہ اس کا حق ادا کر سکتا ہے۔"
>
> (۵)

اصغر ندیم سیّد چونکہ فکری اعتبار سے ترقی پسند فلسفہ حیات کے علمبردار ہیں، لہٰذا ان کے ڈراموں میں اس نظریے کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے انہوں نے کئی تحقیقی و تنقیدی کام بھی سرانجام دیے۔

- PhD Research work on Waqar Azeem as a fiction critic
- Articles more than twenty-five in various literary articles.
- Research articles on eighteen fifty-eight mutiny and literature presented in Maulana Azad
- Research done on Baluchistan's customs and Historic Values.
- Research done on Gender Sensitization in Pakistani Media.

ان پر اب تک ۳ تحقیقی کام مختلف جامعات میں ہو چکے ہیں۔ ان کی کتابیں ذیل میں درج ہیں۔

- طرزِ احساس (تنقیدی کتاب)
- ادھوری کلیات (شاعری)

- جنگل کے اس پار جنگل (شاعری)
- آدھے چاند کی رات (ناولٹ)
- دریا (ڈراما)
- چاند گرہن (ڈراما)
- ترکی باترکی (سفر نامہ)
- زمیں زد کے افق (ترجمہ شاعری)
- نئے زمانے کی بہاریں

i۔ طرزِ احساس (تنقیدی کتاب)

یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں سنگِ میل پبلیکیشنز سے شائع ہوئی۔ یہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں کل ۲۴ مضامین ہے اس کے سرورق پر درج ہے کہ:

> "یہ مضامین اردو میں جدید تر شعری اور ادبی رویوں کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ یہ رویے ایک طرزِ احساس اور ایک تخلیقی مزاج کے بطن سے پھوٹتے ہیں۔"(۶)

ii۔ آدھے چاند کی رات (ناولٹ)

۱۹۹۳ء میں نیاز احمد نے سنگِ میل پبلیکیشنز سے شائع کروائی۔ ان کا ناولٹ معاشرتی موضوع کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے نیز مرد اور عورت کے جذبات کا بیانیہ لیے ہوئے ہے۔

> "ان کا پہلا ناولٹ "آدھے چاند کی رات" عورت اور مرد کے باطنی رشتے کو بیان کرنے کی ایک کوشش ہے۔"(۷)

iii۔ ادھوری کلیات

ادھوری کلیات ۲۰۱۴ء میں سنگِ میل پبلیکیشنز نے شائع کی۔ یہ ان کی شاعری کی کلیات ہے۔ جس میں نظموں کو شامل کیا گیا۔ نظموں کے عنوان دلچسپ اور سادہ ہیں۔ ان میں زیادہ تر آزاد نظمیں شامل ہیں۔

"کھلے موسم کی ایک نظم

گندم پکنے کے موسم میں
اپنے تیر اور اپنی کمانیں نیچی رکھنا
اس موسم کے طائر سُر میں ہوتے ہیں
اور ان کی اڑانیں اکثر نیچی ہوتی ہیں
گندم پکنے کے موسم میں
اپنے تیر اور اپنی کمانیں نیچی رکھنا"(۸)

iv۔ زمیں زد کے افق (ترجمہ شاعری)

یہ ان کی تراجم کی کتاب ہے جس میں انہوں نے عالمی شعرا کی شاعری کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

"عالمی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد میں مجبور ہو گیا کہ ان نظموں کو اردو میں ترجمہ کرنا چاہیے۔ دنیا کے ترقی پسند شاعروں نے خوبصورت معاشرے کی تشکیل میں جدوجہد کرتے ہوئے جو شاعری کی میں نے اسے اردو میں ترجمہ کر کے کتاب میں پیش کیا۔ پھر کورین شاعری کو بھی اردو میں کیا۔ پھر نثر میں کچھ بے حد عظیم ادب کو بھی ترجمہ کیا یہ کام جاری ہے۔ ایسا کام اردو میں زیادہ ہونا چاہیے۔ ترجمے میں دلچسپی کی وجہ ادب اور شاعری کا ذوق ہے۔ جس ادب سے روحانی خوشی ملتی ہے اسے ترجمہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"(۹)

v۔ کہانی مجھے ملی:

یہ کتاب دس کہانیوں کا مجموعہ ہے جو ۲۰۱۷ء میں سنگِ میل پبلشرز سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں موجود کہانیاں پاکستان کی سیاسی اور تاریخی صورتحال واضح کرتی ہیں۔ ماضی کے واقعات کو قصے کے انداز

میں قلم بند کیا گیا ہے۔ اس میں میں ۱۱/۹ اور سقوطِ ڈھاکہ وغیرہ جیسے واقعات لکھے ہیں۔ بقول اصغر ندیم سیّد:

"یہ تمام واقعات جو میں نے تحریر کیے ہیں، لکھے ہیں وہ سب صحیح ہیں، سچے ہیں، ان کے کردار کچھ ہیں کچھ نہیں رہے۔۔۔۔۔۔ان دس کہانیوں کے اندر آپ کو پاکستان کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کی ساری جھلکیاں کہیں نہ کہیں ملیں گی۔"(۱۰)

اصغر ندیم سیّد کے ڈراموں کے نام حسبِ ذیل ہیں، جو ان کے صنف ڈراما کے تئیں ان کی لگن اور اس صنف کی آبیاری میں ان کی جانفشانی کو واضح کرتے ہیں۔ "دریا"، "پیاس"، "خواہش"، "چاند گرہن"، "میگھ ملہار"، "غلام گردش"، "آلاؤ"، "نجات"، "آوازیں"، "ہوائیں"، "محبتیں"، "جو بات گھر میں ہے"، "چاند نگری"، "خدا زمیں سے گیا نہیں ہے"، "بول میری مچھلی"، "تم ہو کہ چپ"، "دل تو بھٹکے گا"، "انّ داتا"، "غریبِ شہر"، "مون سون" وغیرہ۔

نجات: یہ کل تیرہ اقساط کا ڈراما ہے۔ جو پی۔ ٹی۔ وی پر ۱۹۹۳ء میں نشر ہوا۔ اس ڈرامے میں شہر اور دیہات کی عورت کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ اس کو سندھ میں فلمایا گیا ہے۔ جس میں تین خاندان دکھائے گئے ہیں۔

آخری گیت: "ادارہ **لوک ورثہ**" کی طرف سے بنائی گئی پہلی تجرباتی ویڈیو فلم تھی۔ اس میں انہوں نے تھر پارکر کی ثقافت، لوک ورثے اور گیتوں کی تلاش کے سفر کو ایک رومانوی کہانی کی صورت میں بیان کیا۔

ہوائیں: ان کی اور ان کی اہلیہ کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ جو آج بھی ان لوگوں کے ذہنوں میں زندہ ہے جنہوں نے اس ڈرامے کو دیکھا ہے۔ یہ ایک غریب گھرانے کی کہانی ہے۔ جس کے سربراہ کو قتل کے جھوٹے الزام میں تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ کہانی اس کے بعد اہلِ خانہ کو پیش آنے والی مشکلات کا احاطہ کرتی ہے۔

اصغر ندیم سیّد آج کل ایک ناول اور اپنی سوانح نگاری پر کام کر رہے ہیں۔ اصغر ندیم سیّد ایک باشعور اور سنجیدہ ڈراما نگار ہیں۔ ملک کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی و تاریخی پہلوؤں پر ان کی گہری نظر ہے، ساتھ ہی فن و تکنیک کے قدیم و جدید اصولوں پر بھی مکمل گرفت ہے، لہٰذا فن اور فکر کے حسین امتزاج سے انھوں نے کئی ڈرامے تخلیق کیے اور اردو ادب میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔

ان کا ماننا ہے کہ تنقید کی جدید تھیوریاں ادب کو سمجھنے میں مدد تو دیتی ہیں مگر تنقید کے بغیر بھی قاری ادب کو سمجھ لیتا ہے۔ اچھے ادب کو کسی نقاد کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے تنقید لازمی نہیں ہے۔ اچھا ادب تنقید کا محتاج نہیں ہے۔ اصغر ندیم سیّد آج بھی ڈراما نگاری میں اپنا نام بنا رہے ہیں۔

ج۔ اردو ڈراما تعارف:

معاشرتی عمرانیات کا اصول ہے کہ ہر پرانا نظام نئے نظام کے لیے جگہ خالی کرتا ہے۔ بعض پرانے معاشرتی اور تہذیبی نظام نئے معاشرے میں بھی زندہ رہتے ہیں اور اکثر نظامِ کہنہ کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ جب تک معاشرے کا تصور زندہ ہے تب تک ایسا ہوتا رہے گا۔ یہ تاریخی اقدار ایسے ہی چلتی رہیں گی۔ اس تغیر و تبدل سے کوئی تحریک اور رجحان ایسا نہیں ہے جو متاثر نہ ہوا ہو۔ ادب کو بھی بہتر بنانے کے لیے اس میں نت نئے تجربات کرنے پڑتے ہیں۔ ڈرامے کے فن میں بھی یہی عمل نظر آتا ہے۔

مسلّمہ حقیقت یہی ہے کہ نئی عمارت قدیم آثار پر ہی استوار کی جاتی ہے۔ اردو زبان شاہی سلطنت میں پروان چڑھتے ہوئے دیگر زبانوں کے اشتراک سے وجود میں آئی۔ آج اردو کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس زبان نے بہت کم وقت میں ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے مختلف اصنافِ ادب کو اپنے اندر جذب کر لیا۔

انگریزی اور سنسکرت ڈراموں کی تقلید میں اردو زبان میں بھی ڈرامے لکھے گئے۔ بہت سے ڈرامے دوسری زبانوں سے ترجمہ بھی ہوئے۔ ابتدا میں ڈراما کی صنف نے کوئی خاص ترقی نہ کی کیونکہ اس پیشے کو موزوں خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ نیز اس کے کردار بھی تمدنی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اسٹیج کی آرائش و زیبائش کو بہتر بناتے ہوئے جوں جوں ڈرامے نے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کیں، منظر نگاری اور کردار نگاری میں بھی بہتری آنا شروع ہو گئی۔ آج اردو ڈرامے نے اتنا عروج حاصل کر لیا ہے کہ وہ عالمی ڈراموں کے مقابل کھڑا ہو سکتا ہے۔

ڈراما یونانی لفظ ڈراؤ سے ماخوذ ہے جس کے معنی "کر کے دکھانے" یا "دکھائی ہوئی چیز" کے ہیں۔ ڈراما ایسی کہانی یا قصہ ہے جو کرداروں کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح قدیم یونانی: لفظ δρᾶμα,

(drama)سے اخذ ہوئی جس کے معانی حرکت، عمل یا فعل کے ہیں۔ اس لفظ کا ماخذ ایک قدیم یونانی فعل : δράω, draō ہے جس کے معانی 'کرنا' یا 'دکھانے' کے ہیں۔

"ڈراما اصطلاح میں اس صوفی کلام کو کہتے ہیں جو بلا تخصیص نظم و نثر مستانی مضامین پر حاوی ہو گئی اور جو ایکٹروں کے ذریعے سے اسٹیج پر پبلک کے سامنے پیش کیا جائے وہ جو ہمیشہ تہذیب اخلاق یا اصلاح تمدن کا پہلو لیے ہو، ٹریجڈی کا تعلق نفسِ انسان زندگانی اور زمانے کے نشیب و فراز سے ہوتا ہے"(۱۱)

چھٹی صدی قبل مسیح سے دور حاضر تک ڈرامے کی تاریخ، ڈرامے کی اقدار اور روایات کی ایک لمبی داستان نظر آتی ہے۔ ڈرامے کی تنقید کے حوالے سے پہلا نام افلاطون کا ہے اور اس کے بعد سے آج تک ڈرامے پر تنقیدی کام جاری و ساری ہے۔ برصغیر کی سرزمین مصر اور یونان کی طرح نئے اور پرانے تہذیب و تمدن کا مرکز رہی ہے۔ اسی باعث ڈراما مختلف تہذیبی مدارج طے کرتا ہوا آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ ڈراما چوں کہ دیارِ غیر کا سفر کرتے ہوئے ہم تک پہنچا ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ برصغیر میں پہلے ہندو ڈرامے کی ابتدا ہوئی اور سنسکرت ڈرامہ بامِ عروج کو پہنچا۔ اس کے بعد بدھ مت اور جین مت میں بھی مذہبی ڈرامے پیش کیے جانے لگے۔ اس بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں کی دی جا سکتی کہ اردو ڈرامے کی ابتدا کب ہوئی۔ اردو ادب کی تمام اصناف نے ہر جگہ الگ الگ زمانوں میں پرورش پائی۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

"بہترین ڈراما وہی سمجھا جاتا ہے جس میں فن اور ساز و سامان کے ساتھ ساتھ اور سب باتیں کامیابی کے ساتھ پیش ہوتی ہیں۔ کیونکہ تماشا دیکھنے والوں میں مختلف مذاق اور معیارات کے لوگ ہوتے ہیں کسی کو موسیقی رقص سے زیادہ رغبت ہوتی ہے کوئی اداکاری سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے بعض افراد منظر کی دلکشی میں اپنے ذوق کی آسودگی تلاش کرتے ہیں کچھ لوگ ہدایت کار کی ہدایت کاری پر نظر رکھ کر اپنی دلچسپی حاصل کرتے ہیں اگر یہ سب باتیں مجموعی اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو ڈراما کامیاب ہو جاتا ہے۔"(۱۲)

ڈرامے کی دو بڑی اقسام حزنیہ (ٹریجڈی) اور طربیہ (کامیڈی) ہیں۔ حزنیہ غم آگیں اور اندوہناک واقعات پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کے کردار سنجیدہ، عظیم اور بالائی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس طربیہ کے واقعات مسرت اور خوشی کے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ ان کا انجام بخیر ہوتا ہے اور اس کے کردار نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں کرداروں کی طبقاتی تقسیم ہی حزنیہ اور طربیہ کے مابین سب سے بڑی وجہ امتیاز رہی ہے۔ چنانچہ سترہویں صدی عیسوی تک یہی کلیہ کار فرما رہا ہے کہ حزنیہ صرف اس وجہ سے حزنیہ نہیں کہ اس میں غم والم ہو بلکہ ہر وہ ڈراما جس میں بادشاہوں اور عظیم انسانوں کو پیش کیا جائے اسے حزنیہ کہا جاسکتا ہے اور طربیہ صرف ادنیٰ طبقے کے کرداروں سے تعلق رکھتا ہے۔ سترہویں صدی عیسوی کے بعد اس نظریے سے اختلاف ظاہر ہونا شروع ہوا۔ اٹھارہویں صدی تک ارسطو کی تقسیم بالکل باطل قرار دے دی گئی، اور یہ نظریہ محکم صورت اختیار کر گیا کہ حزنیہ میں نہ صرف اونچے طبقے کے کرداروں سے ہمدردی کے جذبات پیدا کیے جاسکتے ہیں بلکہ نچلے طبقے کے کردار بھی جذبات کو ابھارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

موجودہ عہد میں حزنیہ کے لیے اعلیٰ طبقے کے کرداروں کی کوئی شرط نہیں ہے۔ البتہ حزن و ملال کا عنصر

اس میں مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ طربیہ ڈرامے عموماً ایسے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں جن کی ابتدا خواہ کسی انداز میں ہوئی ہو وہ خوشی اور راحت پر ختم ہوتے ہیں۔ ان میں سنجیدہ اور شگفتہ پلاٹ ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور طنزیہ اور مزاحیہ عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ مزاح اور طنز نہایت بلند پایہ اور اعلیٰ ہوتا ہے، اور ابتذال و سوقیت کی حدوں کو نہیں چھوتا۔ ڈرامے کی ان دو بڑی اقسام کے علاوہ بعض ڈرامے ایسے بھی ہیں جو ان دونوں کی آمیزش سے وجود میں آتے ہیں۔ انہیں ''ٹریجڈی کامیڈی'' یا المطربیہ ڈرامے کہا جاتا ہے۔ محمد حسن رضوی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "ٹریجڈی اور کامیڈی میں انسانی مصائب اور شدید رنج و غم مصیبت و الم کا بیان ہوتا ہے اور کامیڈی ظریفانہ دل خوش کن مضامین ادا کیے جاتے ہیں یا یوں کہیے کہ اوّل الذکر کی بنیاد جذباتِ عالیہ صفاتِ پاکیزہ جرائم شدید اور مصائب عظیم پر ہے اور آخر الذکر کا مدار خوشی ظرافت اور لغزشِ انسانی پر۔۔۔۔۔"(۱۳)

ٹریجڈی کو عام طور پر پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر حصے کو ایکٹ کہتے ہیں۔ پہلے ایکٹ میں تجسس کو بڑھاوا دیا جاتا ہے تاکہ تماشائی متوجہ ہو سکیں۔ ابتدائی ایامِ ڈرامہ نویسی میں ایک شخص اسٹیج پر آکر کہانی کا خلاصہ بتا دیتا تھا جس سے کہانی میں لطف اور دلچسپی ختم ہو جاتی تھی۔ اب دورِ جدید میں کرداروں اور مناظر کے ذریعے اس کام کو عملاً پیش کیا جاتا ہے۔ دوسرے، تیسرے اور چوتھے ایکٹ میں کہانی زور پکڑتی ہے اور کہانی کلائمکس کی منازل طے کرتی ہوئی پانچویں ایکٹ یعنی اختتامیہ پر پہنچ جاتی ہے۔ اختتام میں پلاٹ کو سلجھایا جاتا ہے۔ اس قسم کے ڈرامے میں طنز و مزاح اور ظرافت کے ساتھ ساتھ غم والم کے خفیف اثرات بھی ہوتے ہیں۔

میلوڈراما: میلوڈرامایونانی لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں گیت۔ اس قسم کے ڈراموں میں گانوں کی کثرت ہوتی ہے اور بعض خصوصیات میں انہیں اوپیرا سے مشابہ کہا جاسکتا ہے۔ اس ڈرامے میں ایسے واقعات ہوتے ہیں جس میں ایک واقعہ دوسرے واقعے سے مل رہا ہوتا ہے۔ اس میں تجسس، کشاکش، ہیجان، شدت اور غیر فطری رویوں کے باعث طوالت سے کام لیا جاتا ہے۔

فارس: اس میں عامیانہ طنز و ظرافت ہوتا ہے اور اس کا مقصد محض طبع تفریح ہوتا ہے۔

براسک: یہ بھی مزاحیہ ڈرامے کی ایک قسم ہے۔ اس کا مقصد بھی عامیانہ تفریح اور تماشائیوں کو گھٹیا ہنسنے

ہنسانے کا سامان مہیا کرنا ہوتا ہے۔ کمتر درجے کے لوگ اعلیٰ اور شریف اشخاص کی نقلیں اتارتے ہیں اور اعلیٰ شخص رذیلوں کی حرکات اختیار کرتے ہیں۔

اوپیرا: یہ منظوم ڈراما ہے۔ اس میں ڈراما خواہ مزاحیہ ہو یا المیہ نغمہ و موسیقی کا زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ غنائیہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے، چاہے قصہ المناک ہو یا طربناک۔

ڈرامہ نگاری کے فن میں اس کے مکمل لوازمات کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی موجود نہ ہو تو ڈراما مکمل شکل میں نہیں آسکتا۔ بقول ڈاکٹر عشرت رحمانی:

"ابتدا میں ارسطو نے ڈرامے کے چھ بنیادی عنصر قائم کیے تھے ان میں کہانی کے کردار ، الفاظ، خیال، آرائش اور موسیقی شامل ہیں اور ان سب میں کہانی کے تسلسل اور روانی کو خاص اہمیت دی ہے۔"(۱۴)

ڈراما نگاری کے لوازمات کی اختصار کے ساتھ وضاحت ذیل میں موجود ہے۔

i۔ پلاٹ:

ڈرامے کی کامیابی کا انحصار پلاٹ یا کہانی پر ہوتا ہے۔ پلاٹ کی اہمیت ڈرامے میں ایسے ہی ہے جیسے ایک عمارت کی تعمیر میں اس کی بنیادیں، اگر بنیادیں کمزور ہوں تو عمارت قائم و دائم نہیں رہ سکے گی۔ اس لیے یہ بات قابل توجہ ہے کہ پلاٹ کی بنیاد مضبوط اور اس کی تمام کڑیاں چست اور پیوست ہوں۔ فنی اعتبار سے ڈرامے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جنہیں پلاٹ، کردار نگاری اور زبان و بیان یا اسلوبِ بیان سے موسوم کرتے ہیں۔ ڈرامے کے پلاٹ میں واقعات کی ترتیب ہونی چاہیے، کردار نگاری میں کرداروں کی عمر، نفسیات، طبقے، تعلیم و تربیت اور خاندانی خصوصیات کا خاص خیال رکھا جانا بہت ضروری ہے۔ ڈرامے کی زبان میں متاثر کرنے کی خصوصیت کا ہونا ضروری ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی ڈرامے کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ڈرامے یا تو حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں یا پھر بالکل ہی فرضی کرداروں پر۔ تحریکِ آزادی ہند، معاشرتی، اور گھریلو موضوعات رکھنے والے ڈرامے حقیقت پر مبنی ہو سکتے ہیں۔ تاہم لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد جیسے کرداروں پر مبنی ڈرامے فرضی ہوتے ہیں۔ ڈراموں کے کئی موضوعات تخیل پر مبنی ہو سکتے ہیں۔ دریں ازاں ان کے پس پردہ ضرور کوئی تاریخی سچائی اور زبان زد عام بات بھی ممکن ہے۔ حقیقت پر مبنی ڈراموں کے حوالے سے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ ان کی پیش کش کے دوران تاریخی دور، مخصوص تہذیبی پس منظر، کرداروں کے نفسیاتی پہلو، تحریکات اور روایات کا خیال رکھا جائے۔ کسی ڈرامے کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر کردار کی ادائیگی کرنے والا اپنے ذاتی تصورات کو چھوڑ کر کردار کی سوچ، اس کے خیالات، جذبات اور مکالموں کو مکمل طور پر حسبِ موقع ادا کرے۔

ii۔ کہانی کا مرکزی خیال یا تھیم:

مرکزی خیال کی اہمیت ہی کہانی میں دلچسپی اور افادیت کو بڑھاتی ہے۔ یہ ڈرامے کا اہم جزو ہے۔ ڈراما نگار کسی خیال کی بنیاد پر پلاٹ مرتب کرتا ہے جس سے اس کی کہانی تشکیل پاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر عشرت رحمانی: "پلاٹ کو عطر تسلیم کرے تو مرکزی خیال روحِ عطر ہے۔"(۱۵)

iii۔ آغاز

ڈرامے کا ابتدائی حصہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اگر ڈرامے کا آغاز خوبصورت یا دلچسپ نہیں ہو گا تو تماشائیوں کی دلچسپی ڈرامے میں پیدا نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ڈرامے کا آغاز مؤثر اور دلچسپ ہو جو تماشائیوں کی دلچسپی کا سامان کر سکے۔

iv۔ کردار و سیرت نگاری

جس طرح پلاٹ کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مرکزی خیال اور کہانی کو مؤثر بنایا جائے، اسی طرح قصہ یا کہانی کو کامیاب بنانے کے لیے کردار نگاری میں جان ڈالنا ضروری ہے۔ کردار کو حقیقت کے قریب ترین دکھایا جائے۔ کردار مؤثر اور کہانی کے عین مطابق ہوں۔ ان کے مکالمے ان کی حرکات و سکنات سے میل کھاتے ہوں۔ اسی باعث کردار لوگوں کے ذہنوں میں زندہ رہ سکتے ہیں۔

v۔ مکالمہ

مکالمے کے ذریعے ہی کردار اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ مکالمے کہانی کی جان ہوتے ہیں۔ چنانچہ مکالمے ہمیشہ سادہ ہوں ان میں معیوب اور ثقیل الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے۔ مکالمے

طویل نہ ہوں۔ غیر ضروری مکالمے پیش نہ کیے جائیں تاکہ اصل یا اہم مکالموں کی اہمیت قائم رہے۔

vi۔ تسلسل، کشمکش اور تذبذب

کامیاب ڈرامے کے لیے کہانی کی تمام کڑیوں کا آپس میں مربوط ہونا ضروری ہے۔ تماشائیوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ کشمکش تماشائیوں کو حیرت و انبساط میں ڈال دے، ایسے حالات

پیدا ہوں جو ڈرامے میں مزید دلچسپی پیدا کریں مگر کہانی کا رخ غیر متوقع اور غیر فطری حالات کی طرف نہ موڑا جائے۔

vii۔ تصادم

تصادم ڈرامے کے لیے بے حد ضروری شے ہے۔ تنقید نگار اس کے بغیر ڈرامے کو نامکمل مانتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے بغیر کہانی نقطہ عروج کو نہیں پہنچ سکتی۔ دو کرداروں یا دو چیزوں کے تصادم سے کہانی جان پکڑتی ہے۔ تصادم دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ بقول ڈاکٹر عشرت رحمانی:

> "داخلی تصادم انسان کے اپنے جذبات و احساسات شعور اور تحت الشعور کے درمیان واقع ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ دو کرداروں یا دماغوں یا کسی کردار کا نامعلوم طاقت سے مصروفِ کشمکش ہو جانا اور متضاد ٹکر لینا خارجی تصادم ہے۔"(۱۶)

viii۔ نقطہ عروج ، کلائمکس (climax)

یہ وہ دروازہ ہے جس کے کھلنے کا انتظار تماشائی بے چینی سے کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ کشمکش اور تصادم کے بعد کہانی کو نئے رخ سے پیش کیا جائے تاکہ دیکھنے والے کی دلچسپی میں اضافہ ہو سکے۔ وہ انجام دیکھنے کے لیے بے قرار اور بے چین ہو۔ اس حوالے سے احتیاط لازم ہے کیوں کہ ذرا سی بے احتیاطی ڈرامے کو بے جان کر دیتی ہے۔ چنانچہ ڈراما نگار کو پہلے ہی واقعات کو ترتیب دے لینا چاہیے جس سے انجام مؤثر بنایا جا سکے۔

ix۔ انجام

نقطہ عروج کے بعد انجام آتا ہے۔ اگر کلائمکس عمدہ ہے تو انجام خود بخود اچھا ہو گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ نقطہ عروج کو زیادہ مؤثر بنایا جائے۔ نتیجہ خیز انجام کی عمدگی اس وقت ثابت ہو سکے گی جب کشمکش، تصادم،
کلائمکس، کردار، مکالمے سب اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے احسن طریقے سے کام سرانجام دیں گے۔
ڈرامے کو کئی اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔

اسٹریٹ ڈراما: یہ ڈرامے کسی عوامی موضوع یا عوام میں کسی موضوع کے حوالے سے بیداری کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً، بڑھتی آبادی، گھریلو تشدد، معاشرے میں عورت کا مقام، وغیرہ۔

اسٹیج ڈراما: یہ ڈراما کسی گروپ، اسکول یا کالج میں حاضرین کے روبہ رو پیش ہوتا ہے۔

ٹی وی ڈراما: یہ ڈرامے ایک بار میں بھی ختم ہوتے ہیں اور سیریل کی طرح جاری بھی رہتے ہیں۔

ریڈیو ڈرامے: یہ ٹی وی ڈرامے ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ مگر ان میں تصویر نہیں دکھائی جاتی۔

فلمی ڈراما: ہر فلم دو یا تین گھنٹے کا اپنے آپ میں منفرد ڈراما ہوتی ہے۔

د۔ اردو ڈرامے کا آغاز وارتقا

ہندوستان میں ڈرامے کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس کی ابتدا چوتھی صدی قبل مسیح میں بتائی جاتی ہے۔ ڈراما ہند آریائی تہذیب کا ایک اہم جزو رہا ہے۔ قدیم آریائی تہذیب جب اپنے عروج پر تھی تو اس کے ساتھ سنسکرت ڈراما بھی تمام تر لطافتوں، نزاکتوں اور اپنی مخصوص روایات کے دامن میں سمیٹے درجۂ کمال کو پہنچ چکا تھا۔ آریائی تہذیب و معاشرت کے زوال کے ساتھ ساتھ سنسکرت ڈرامے پر بھی زوال کے بادل چھا گئے۔ سنسکرت زبان اور اس کا ادب درباری سرپرستی سے محروم ہو گیا۔ دوسری طرف سنسکرت عوامی زبان کبھی نہ تھی۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں سنسکرت ڈرامے کا خاتمہ ہو گیا۔ چونکہ دوسری علاقائی اور مقامی زبانوں میں ڈرامے کے آرٹ کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت نہ تھی اس لیے عوام نے اپنی دلچسپی اور تفریحی شوق کی تسکین کے لیے رام لیلا، کرشن لیلا اور اسی طرح کے دوسرے مذہبی، عشقیہ اور معاشرتی کھیلوں کا سہارا لیا۔ ان تماشوں اور کھیلوں کے لیے نہ کوئی مخصوص عمارت ہوتی تھی اور نہ کوئی باقاعدہ اسٹیج ہوتا تھا۔ ان کی رائج صورتیں سوانگ، بہروپ اور نوٹنکی وغیرہ تھیں۔ ان میں نہ تو فنی اصولوں کو ملحوظ رکھا جاتا تھا اور نہ دیکھنے والوں کے نزدیک تفریحِ طبع کے علاوہ کوئی اہمیت تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ڈرامے کی صنف پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ جب کہ دوسرے علوم و فنون کی ترویج و ترقی میں مسلمان حکمرانوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کا بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ نہ تو عربی و فارسی ڈرامے کی کوئی روایت ان کے سامنے تھی، نہ سنسکرت ڈرامے کی روایت باقی تھی۔ چنانچہ ڈرامے کے حوالے سے کوئی کام نہ ہو سکا۔ اردو

ڈرامے کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی عمر بہت مختصر ہے۔ اردو کے تقریباً تمام محققین، مسعود حسن رضوی ادیب کے اس خیال سے متفق ہیں کہ نواب واجد علی شاہ اردو کے پہلے ڈراما نگار ہیں اور ان کا رہس "رادھا کنھیّا کا قصہ" اردو ڈرامے کا آغاز ہے۔ یہ رہس واجد علی شاہ کی ولی عہدی کے زمانے میں "قیصر باغ" میں ۱۸۴۳ء میں بڑی شان سے کھیلا گیا۔ واجد علی شاہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی، رقص و سرود اور آرٹ کے بڑے دلدادہ اور مدّاح تھے۔ "رادھا کنھیّا کے قصے" کے علاوہ واجد علی شاہ کے دوسرے رہس بھی بڑی آن بان سے شاہی اسٹیج پر دکھائے گئے۔

ایک طرف واجد علی شاہ کے رہس تھے جو "قیصر باغ" تک محدود تھے اور دوسری طرف ۱۸۵۳ء میں سید آغا حسن امانتؔ کا "اندر سبھا" عوامی اسٹیج پر پیش کیا جارہا تھا۔ گو تاریخی لحاظ سے واجد علی شاہ کے رہس کو امانت کے اندر سبھا پر تقدم حاصل ہے لیکن بے پناہ شہرت، ہر دلعزیزی اور قبولِ عام کی سنّد "اندر سبھا" کے حصے میں آئی مسعود حسن رضوی ادیبؔ لکھتے ہیں:

> "اندر سبھا اردو کا پہلا ڈراما نہیں ہے لیکن اس سے اُس کی تاریخی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی، وہ اردو کا پہلا ڈراما ہے جو عوامی اسٹیج کے لیے لکھا اور کھیلا گیا۔ وہ پہلا ڈراما ہے جس کو عام مقبولیت نے ملک میں شہر شہر اور اودھ میں گاؤں گاؤں پہنچا دیا۔ وہ اردو کا پہلا ڈراما ہے جو چھپ کر منظرِ عام پر آیا اور سینکڑوں مرتبہ شائع ہوا۔ وہ اردو کا پہلا ڈراما ہے جو ناگری، گجراتی اور مراٹھی خطوں میں چھاپا گیا"(۱۷)

"اندر سبھا" کی کامیابی اور شہرت کے زیرِ اثر اسی طرز پر لکھنؤ اور دوسرے مقامات میں کئی سبھائیں اور ناٹک لکھے گئے۔ مثلاً اندر سبھا (مداری لال)، فرخ سبھا، راحت سبھا، (راحت)، جشن پرستان، ناٹک جہانگیر، عشرت سبھا، گلشن بہار افزا اور لیلیٰ مجنوں وغیرہ وغیرہ۔ امانت کے "اندر سبھا" کے بعد مداری لال کا "اندر سبھا" سب سے زیادہ مقبول ہوا۔

اردو ڈرامے کا دوسرا اہم مرکز بمبئی تھا۔ جس زمانے میں شمالی ہندوستان یعنی اودھ اور اس کے مضافات میں اندر سبھا دکھایا گیا۔ تقریباً اسی زمانے میں اندر سبھا بمبئی کے اسٹیج پر بھی پیش کیا گیا اور اسے بڑی

مقبولیت حاصل ہوئی۔ اردو ڈراما پارسی اربابِ ذوق کی سرپرستی میں پروان چڑھا۔ انھوں نے اردو ڈرامے کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ڈرامے کے فن سے دلچسپی اور مالی منفعت کے پیشِ نظر پارسیوں نے بڑی بڑی تھیٹریکل کمپنیاں قائم کیں۔ جن کے اپنے ڈراما نگار، ڈائریکٹر اور کام کرنے والے ہوتے تھے۔ زیادہ تر ڈراموں کا موضوع وفاداری، سچائی اور شرافت ہوتا تھا اور ان کے قصے دیومالا، قرونِ وسطیٰ کی داستانوں اور شیکسپیئر کے ڈراموں پر مبنی ہوتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر تک ڈرامے کے فن کو نہ تو سنجیدگی سے برتا گیا اور نہ اس کی پذیرائی کی گئی۔ امانتؔ اور مداری لال کے اندر سبھا کے تتبع میں جو ڈرامے لکھے گئے وہ زیادہ تر منظوم ہوتے تھے۔ رقص و سرود پر زور دیا جاتا تھا۔ جن کمپنیوں کے لیے ڈرامے لکھے جاتے تھے، وہ خالص تجارتی نقطۂ نظر سے مختلف شہروں کے دورے کرتیں۔ اس زمانے میں اردو اسٹیج پر منشی رونقؔ بنارسی، حافظ عبداللہ، نظیر بیگ اور حسینی میاں ظریف چھائے ہوئے تھے۔ منشی رونقؔ بنارسی، پارسی وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی کے خاص ڈراما نگار تھے۔ ان کے ڈراموں میں "بے نظیر بدرِ منیر" "لیلیٰ مجنوں" "نقشِ سلیمانی" "سنگین بکاؤلی" "عاشق کا خون" اور "فسانۂ عجائب عرف جانِ عالم انجمن آرا" وغیرہ مشہور ہوئے۔

حسینی میاں ظریفؔ، پسٹن جی فرام جی کی پارسی اوریجنل کمپنی کے ڈراما نگار تھے۔ ان کے ڈراموں میں "خدا دوست"، "چاند بی بی"، "شیریں فرہاد"، "حاتم طائی"، "چراغ اللہ دین"، "لیلیٰ مجنوں" اور "علی بابا" کو خاص شہرت ملی۔

حافظ عبداللہ "لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی" سے وابستہ رہے۔ یہ انڈین امپیریل تھیٹریکل کمپنی فتح پور کے مالک بھی تھے۔ حافظ عبداللہ کے ڈراموں میں "عاشق جانباز"، "ہیر رانجھا"، "نور جہاں"، "حاتم طائی"، "لیلیٰ مجنوں" اور "جشن پرستان" وغیرہ مشہور ہوئے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں پارسی تھیٹر میں بعض ایسے ڈراما نگار شامل ہو گئے جنھوں نے اردو ڈرامے کی روایت کو آگے بڑھایا اور اس میں چند خوش گوار اور صحت مند تبدیلیاں لا کر اسے نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ ڈرامے کا معیار بلند کیا، اسے معاشرتی موضوعات اور سنجیدہ عناصر سے روشناس کرایا اور کسی حد تک فنّی شعور کا

ثبوت دیا۔ اس دور کے ڈراما نویسوں میں ونائک پرشاد طالبؔ بنارسی، مہدی حسن احسنؔ لکھنوی اور پنڈت نرائن پرشاد بیتابؔ بنارسی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ طالب کے ڈراموں میں "نگاہِ غفلت"، "گوپی چند"، "ہریش چندر" اور "لیل ونہار" مشہور ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول اور اہم ڈراما "لیل ونہار" ہے۔

ابھی اسٹیج پر طالبؔ کے ڈراموں کی گونج ختم نہ ہونے پائی تھی کہ احسنؔ لکھنوی اسٹیج پر چھا گئے۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنے نانا مرزا شوقؔ لکھنوی کی مثنوی "زہرِ عشق" کو "دستاویزِ محبت" کے نام سے ڈرامے کی صورت میں ۱۸۹۷ء میں پیش کیا۔

احسنؔ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شیکسپیر کے ڈراموں کو اردو زبان میں ڈھال کر فنِ ڈراما نگاری کو ایک نیا موڑ دیا۔ حالانکہ احسنؔ سے پہلے ہی یہ کام شروع ہو گیا تھا، مگر صحیح معنوں میں شیکسپیر کو متعارف کرانے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ ان کے ڈراموں میں "چند راؤلی"، "خونِ ناحق عرف مارِ آستین (ہیملٹ)"، "بزمِ فانی (رومیو جولیٹ)"، "دلفروش (مرچنٹ آف وینس)"، "بھول بھلیاں (کامیڈی آف ایررز)" اور "اوتھیلو" بہت مشہور ہوئے۔ احسنؔ نے ڈرامے کی زبان اور نظم و نثر دونوں کو نکھارا اور سنوارا، نیز مکالموں کو دلکش بنایا۔

بیتابؔ نے اردو، ہندی دونوں زبانوں میں ڈرامے لکھ کر اپنی صلاحیت کے جوہر دکھائے اور خوب شہرت حاصل کی۔ ان کا پہلا ڈراما "قتلِ نظیر" ہے جو ۱۹۱۰ء میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی نے اسٹیج پر پیش کیا۔ یہ ڈراما طوائف نظیر جان کے قتل پر مبنی حقیقی ڈراما ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیتابؔ کو اردو ہندی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ بیتابؔ کے ڈراموں میں "قتلِ نظیر"، "زہری سانپ"، "گورکھ دھندا"، "امرت"، "میٹھا زہر"، "شکنتلا"، "مہابھارت"، "رامائن" اور "کرشن سدا" خاص شہرت کے مالک ہیں۔

گو مذکورہ بالا ڈراما نویسوں نے اردو ڈرامے کی ترقی اور اسٹیج کی آراستگی میں قابلِ قدر کارنامے انجام دیے، لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ان ڈراما نگاروں کے یہاں فنّی مہارت کی خامی پائی جاتی ہے۔ اس خامی کو دور کرنے والے ڈراما نگار آغا حشرؔ کاشمیری ہیں۔ جنھوں نے اپنے تخلیقی شعور اور جدّت پسند طبیعت کی بدولت اپنے دور کی ڈراما نگاری کی روایتی روش سے بلند ہو کر فنّی و فکری ارتقا کی اعلیٰ کاریگری کے نمونے پیش

کیے۔ انہوں نے اپنی فنکارانہ صلاحیت اور تخلیقی بصیرت سے اردو ڈرامے کے معیار کو کافی بلند کیا اور سطحی رومانیت کی جگہ ملک کے معاشرتی مسائل کو اپنے ڈراموں میں پیش کیا۔ حشر نے پارسی کمپنیوں اور خود اپنی تھیٹریکل کمپنی کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے جن میں "اسیر حرص"، "شہید باز"، "یہودی لڑکی"، "خواب ہستی" اور "رستم و سہراب" قابل ذکر ہیں۔

ڈرامے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر ادیبوں اور انشاپردازوں نے بھی ڈرامے لکھے لیکن یہ ڈرامے اسٹیج کے لیے نہیں لکھے گئے تھے لہٰذا کتابوں تک محدود رہے۔ اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد کا ڈرامہ "اکبر" مرزا محمد ہادی رسوا کے ڈرامے "مرقع لیلیٰ مجنوں" اور "طلسمِ اسرار" قابل ذکر ہیں۔ محمد حسین آزاد اپنے ڈرامے "اکبر" کو مکمل نہ کر سکے تھے۔ اسے بعد میں ناصر نذیر فراق نے مکمل کیا۔ یہ ڈرامے فنی اعتبار سے زیادہ اہم نہیں البتہ یہ اپنی ادبی شان اور زبان کی دلکشی کی وجہ سے اہم ہیں۔

اردو ڈرامے کو عصری آگہی، قدیم و جدید کی کشمکش اور عام معاشرتی مسائل کا وسیلہ اظہار بنانے والے ڈراما نگاروں میں امتیاز علی تاج اور سید عابد حسین کا نام سر فہرست ہے۔ مغربی طرز پر لکھا گیا عابد حسین کا ڈراما "پردہ غفلت" زمانی ماحول کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی منفرد کردار نگاری اور دیگر فنی محاسن کی وجہ سے نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ سید امتیاز علی تاج کا شہرہ آفاق ڈرامہ "انارکلی" اپنی فنی عظمت، بہترین کردار نگاری اور اپنے خوبصورت مکالموں کی وجہ سے چند بہترین ڈراموں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر محمد مجیب اور فضل الرحمن نے ڈرامے کی روایت کو عظمت بخشی۔ ڈرامہ نگاروں کی کوششوں سے اردو ڈرامے میں سنجیدگی، فکری بالیدگی اور معنوی گہرائی پیدا ہوئی۔ مغربی روایات کی مدد سے نئے نئے تجربوں کے ذریعے اردو ڈرامے کو وسعت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں مرزا ادیب، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، انتظار حسین اور ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ہ۔ پاکستانی ڈراما نفسیات اور عائلی زندگی کے تناظر میں

ڈراما ٹیلی ویژن نشریات کا سب سے مؤثر حصہ ہے۔ ٹیلی ویژن کی تکنیکی ترقی کے ساتھ ساتھ ڈراما بھی

ترقی کرتا گیا۔ موضوعات کے اعتبار سے ڈرامے نے ساری دنیا میں نام کمایا ہے اور ایک دور ایسا بھی آیا کہ پاکستان میں ڈراما ٹیلی ویژن کی آبرو بن گیا۔ ہم پاکستانی ٹیلی ویژن ڈرامے کو چار مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ہر دور دوسرے سے منفرد خصوصیات اور تبدیلیوں کا حامل ہے، مگر ہر دور میں ڈراما نگاروں نے عائلی زندگی اور کرداروں کی نفسیات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے شروع میں جن لوگوں نے لکھا، یا جن کی کہانیوں کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا ان میں امتیاز علی تاج، رفیع پیرزادہ، ضیا سرحدی، جاوید اقبال، راجہ فاروق علی خان، انتظار حسین، عابد علی عابد، حکیم احمد شجاع، صفدر میر، سلیم احمد اور ریاض فرشوری جیسے نامور ادیب شامل ہیں۔ بعد میں پی ٹی وی لاہور سینٹر سے ادیبوں کی ایک نئی ٹیم سامنے آئی، جن میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انور سجاد، کمال احمد رضوی، نصیر انور، منو بھائی، اطہر شاہ خان، آغا ناصر، سلیم چشتی، ذاکر حسین، مختار صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔

ٹیلی ویژن کے آغاز کی نشریات فنی حوالے سے بلیک اینڈ وائٹ ہونے کے ساتھ ساتھ لائیو (Live) یعنی براہِ راست نشر ہوتی تھیں۔ لائیو نشریات میں ڈرامے پروڈیوس کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اسی باعث ابتدا میں ڈراما فنی مسائل کا شکار تھا۔ ہجرت کے واقعات ہوں یا سماجی تجربات، شاعری، افسانے اور ناول کے ساتھ ساتھ ڈرامے نے بھی ان موضوعات کو اپنے اندر سمو لیا۔ اس کے علاوہ سیاسی و سماجی مسائل کو بھی ڈرامے میں جگہ دی گئی۔ پھر جنگ ۱۹۶۵ء بھی ایک بڑا اور نیا تجربہ تھا۔ جس کو موضوع بنایا گیا۔ پہلے دور میں اردو کے مشہور ادیبوں سے ڈرامے لکھوانے کے ساتھ ساتھ ان کی کہانیوں اور ناولوں کو بھی ڈرامائی تشکیل کے بعد پیش کیا گیا۔ اس دور میں زیادہ تر انفرادی ڈرامے لکھے گئے جبکہ سیریل کم کم پیش کیے گئے۔ البتہ چند مزاحیہ سیریز ایسی بھی ہیں جن کو کافی شہرت ملی۔

ٹیلی ویژن پر پیش کیا جانے والا سب سے پہلا ڈراما "نذرانہ" تھا جسے نجمہ فاروقی نے لکھا اور فضل کمال نے پیش کیا۔ اسی دور میں ایک اور مشہور ڈراما "کھنڈر" پیش کیا گیا۔ مختار صدیقی کے لکھے اس کھیل کو آغا ناصر نے پیش کیا۔ اس ڈرامے میں نیر کمال اور طارق عزیز نے اداکاری کی۔ کراچی سے آغا ناصر نے "ضرورت رشتہ" اور خواجہ صاحب کا "تعلیم بالغاں" پیش کیے۔

۱۹۶۵ء میں پاکستان ٹیلی ویژن پر معاشرتی و عائلی نوعیت کے ڈرامے بھی پیش کیے جانے لگے۔ اشفاق احمد نے جو ڈراما سیریز ٹیلی ویژن کے لیے لکھیں، ان میں "قرۃ العین" اہم ہے۔ ڈراما قراۃ العین اختر، اجالا، اورابو نصیر جیسے کرداروں پر مشتمل ہے۔ جن میں اختر اور اجالا اس ڈرامے کے مرکزی کردار ہیں۔ سارا ڈراما انہی کرداروں کو محور بنا کر گھومتا ہے۔ اجالا اور اختر دونوں ہی برابر کے کردار ہیں۔ اس ڈرامے میں اختر جتنا متحرک اور پیش پیش نظر آتا ہے۔ اجالا بھی اتنی ہی متحرک نظر آتی ہے۔

فکری لحاظ سے ڈراما قراۃ العین میں اشفاق احمد نے زندگی کے بہت سے مسائل و حقائق کا تجزیہ کیا ہے۔ جس میں روحانیت اور تصوف کا عنصر بھی شامل ہے۔ نیز اس حقیقت کی ترجمانی بھی کی ہے کہ زندگی نشیب و فراز کا نام ہے۔ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ زندگی کی بہار پر خزاں کا دور بھی دورہ رہتا ہے۔ نیز بہاروں کے تعاقب میں خزاں پانا ایک افسوس ناک امر ہے۔ چنانچہ اجالا اور اختر کی ہنسی خوشی اور قربت کوئی دائمی چیز نہیں۔ عیش و مسرت اور تبسم ہمیشہ ہمیشہ کی آہوں اور سسکیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ تلخ حقیقت کسی فردِ واحد تک محدود نہیں بلکہ ہر ذی روح اسی اٹل قانونِ قدرت کی لپیٹ میں ہے۔ اس کے علاوہ اشفاق احمد نے "چور بخار"، "ننگے پاؤں"، "متاعِ غرور"، "آسان سی بات" جیسے ڈرامے بھی لکھے۔

اس طرح سلیم احمد کے "عکس اور آئینے"، "مجرم"، "ممد بھائی"، "شریف آدمی" اور "جزا و سزا" شوکت صدیقی کے "چور دروازہ" اور "چار بیگھا زمین"، شہزاد احمد کے "بالیاں"، "مہرباں کیسے کیسے" اور "آغوش"، احمد ندیم قاسمی کا "گھر سے گھر تک"، خدیجہ مستور کا "برقعہ"، راحیلہ مسعود کا "گڑیا گھر"، انور سجاد کا "ایک حکایت"، انصار ناصری کا "طبیب"، اے حمید کا "جہاں برف گری ہے" جیسے ڈرامے پیش کیے گئے۔ "منٹو راما" کے عنوان سے سعادت حسن منٹو کی کہانیاں پیش کی گئیں۔ آغا ناصر رقم طراز ہیں:

> "یہ بات وضاحت طلب ہے کہ ان دنوں نشر مکرر کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ریکارڈنگ چلا دی جائے، ریکارڈنگ کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ لہٰذا ایک بار پھر سے ڈرامے کو براہ راست اسی طرح پیش کیا گیا۔ جس طرح پہلے پیش کیا گیا تھا"۔ (۱۸)

پاکستان ٹیلی ویژن ڈرامے کی تاریخ میں پہلا ڈراما سیریل "شہر کنارے" تھا۔ اشفاق احمد کی تحریر کو نثار حسین اور ذکا درانی نے پیش کیا۔ اس دور میں دوسری بڑی اور مقبول سیریل شوکت صدیقی کا ناول "خدا کی بستی" ہے۔ جس کی ڈرامائی تشکیل حمید کاشمیری نے کی۔ جس کا موضوع قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات ہیں۔ مگر اس میں ایسے معاشرتی رویے ہیں جو ہوس میں مبتلا ہو کر اخلاقی حدیں پار کرنے سے کسی طور پیچھے نہیں ہٹتے۔ اس ڈرامے میں گھٹیا معیارِ زندگی اور رشتوں کو کھانے والے گدھوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

ٹیلی ویژن پر موضوعاتی Thematic ڈراما لکھنے کا آغاز ابتدا ہی سے ہو گیا تھا۔ موضوعاتی ڈراما نگاری کی ٹیلی ویژن والوں نے کافی حوصلہ افزائی کی۔ پاکستان ٹیلی ویژن نے ابتدا ہی سے قومی موضوعات پر ڈرامے پیش کر کے موضوعاتی ڈرامے کی روایت ڈال دی تھی۔ ٹیلی ویژن کا آغاز ایک ہنگامہ خیز دور میں ہوا تھا۔ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے موقع پر جو موضوعاتی ڈرامے ٹیلی کاسٹ کیے گئے ان پر جنگ کے اثرات غالب تھے۔ آغاز میں جن ادیبوں سے ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے لکھوائے گئے ان میں منو بھائی، کمال احمد رضوی، آغا ناصر، اشفاق احمد اور عشرت رحمانی پیش پیش تھے۔ ٹیلی ویژن ڈراما نگاری کے دوسرے دور میں موضوعاتی ڈراما نگاری کو ڈراما سیریز "پلیٹ فارم" نے فروغ دیا۔

ڈراما سیریل **دھوپ کنارے** پی ٹی وی پر ۱۹۸۷ء میں پیش کیا جانے والا ایک ڈراما ہے۔ اس کی کہانی ایک سینئر ڈاکٹر احمر اور ٹرینی ڈاکٹر لڑکی زویا کے حالات کے گرد گھومتی ہے۔ اس ڈرامے کی مصنفہ حسینہ معین جب کہ ہدایت کارہ ساحرہ کاظمی تھیں۔ یہ ڈراما پی ٹی وی کے عہد زریں کی یادگار تخلیقات میں سے ایک ہے۔ بنیادی طور پر یہ ڈراما دو ڈاکٹروں (مرینہ خان اور راحت کاظمی) کی بے نام محبت کے گرد گھومتا ہے جو محبت کے ساتھ ساتھ ایک اور انجانے رشتے میں بھی بندھے ہوتے ہیں۔ جس کا علم ان دونوں کو نہیں ہوتا۔ جب دونوں کو اس انجانے رشتے کا علم ہوتا ہے تو یہ ان کے لیے انتہائی دھچکے کا سبب بنتا ہے۔ اس ڈرامے میں پیشہ ورانہ خواتین کی نفسیات اور ان کی عائلی زندگی کی حسین تصویر دکھائی گئی ہے۔

دھوپ کنارے، ان کہی، زیر زبر پیش، تنہائیاں، پرچھائیاں، آہٹ، بندش، دھند، رومی، پڑوسی اور کسک سمیت کئی لازوال ڈرامے تخلیق کرنے والی ۷۷ سالہ حسین معین کو سماج کو بدلنے والے ڈرامے لکھنے والی شاندار اور عظیم ڈراما نگار کہا جاتا ہے۔ ان کے ڈرامے حقیقت اور سچائی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان

کے ڈرامے سبق آموز ناصحانہ رنگ لیے ہوتے ہیں۔ ان کے کردار عام نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے بجائے ان کی

اصلاح کرتے ہیں اور انہیں زندگی کی اصل حقیقتوں سے روشناس کراتے ہیں۔

حسینہ معین کا "پانی پہ لکھا تھا"، خالدہ حسین کا "ٹھنڈا پانی"، خالد محمود زیدی کا "مہمان" اور منشایاد کا "تماشا" مشہور ڈرامے ہیں۔ اس کے علاوہ "تصویر کائنات"، "تمثیل"، "زندگی اے زندگی"، "ٹی وی تھیٹر"، "ایک حکایت"، "رات، ریل اور خط" کے عنوان سے ڈراما سیریز نشر کی گئیں، جن کو مختلف مصنفین نے تحریر کیا۔ علاوہ ازیں "جزیرہ"، شوکت صدیقی کا "رات کی آنکھیں" یونس جاوید کا "گواہی"، "نجات"، "پت جھڑ"، "سمندر"، "پناہ"، حسینہ معین کا "کرن کہانی"، "انکل عرفی"، "پرچھائیاں" (ہینری جیمس کے ناول پورٹریٹ آف لیڈی کی ڈرامائی تشکیل ہے)، "دھند"، "رومی"، "شہزوری" (جو عظیم چغتائی کے ناول کی ڈرامائی تشکیل ہے) مشہور ہیں۔ اس ناولٹ کو ۱۹۷۰ میں ڈرامے کی صورت میں پی ٹی وی پر پیش کیا گیا۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "تارا" ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا اپنے چلبلے پن اور خوش طبعی سے کرتی ہے۔ اس میں ایک ایسے سُسرال کی منظر کشی کی گئی ہے۔ جو اپنی بہو کو ذہنی اذیت سے دوچار کرتے ہیں۔ منظر متوسط گھرانے کا پیش کیا گیا جس میں کئی نفسیاتی الجھنوں کو پردہ تصویر میں ڈھالا گیا ہے۔

گھریلو زندگی پر پیش کیا جانے والا ایک اہم ڈراما سیریل "انکل عرفی" ہے۔ اس کھیل کا اہم کردار انکل عرفی ہے۔ جو کافی عرصہ ملک سے باہر رہنے کے بعد اپنے ملک واپس آتا ہے، اور وہاں مختلف حالات سے اس کا سابقہ پڑتا ہے۔

> یہ ڈراما غیر شادی شدہ مردوں کی غیر متوازی نفسیات، والدین کے بغیر کسی دوسرے کے سہارے زندگی گزارنے والی لڑکیوں کی شخصیت اور پیسے کی ہوس میں لڑکیوں کو بیچ دینے والے انسان نما حیوان پر روشنی ڈالتا ہے۔ (۱۹)

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" کی ڈرامائی تشکیل ۱۹۸۸ء میں کی گئی۔ مضبوط کہانی، دلچسپ مکالموں اور کرداروں کے باعث آج بھی یہ لوگوں کے دماغوں پر چھایا ہوا ہے۔ اصغری اور اکبری کے رویوں میں تضاد موجود ہے جو ان کے نفسیاتی مشاہدے میں دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔

ادب اور فن کی آمیزش براہِ راست معاشرتی رویوں اور رجحانات سے جڑی ہوتی ہے۔ڈرامے میں انہی مسائل کو موضوع بنایا جائے گا جو معاشرے میں موجود ہوں گے۔ اسی باعث ڈراما عائلی و معاشرتی زندگی سے قریب ترین ہوتا ہے، گویا ادب اور معاشرہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہے۔ معاشرے کے مسائل ہمارے ادب میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ڈراما نگاروں نے معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ عام کرداروں کی نفسیات کو بھی نکھار کر پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے اہم ناموں میں سے ایک نام فاطمہ ثریا بجیا کا بھی ہے۔ فاطمہ ثریا بجیا نے "آبگینے" کے عنوان سے مسلمان خواتین کی زندگی اور ان کی خدمات پر ڈراما سیریز لکھیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے کی تربیت کی۔

سیاسی و معاشرتی تبدیلیوں نے پاکستانی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ امجد اسلام امجد کے ڈراما "وارث" نے ٹیلی ویژن پر ایک نئے کلچر کو متعارف کرایا۔ بدترین آمریت کے باوجود جاگیر داریت کے خلاف ٹیلی ویژن نے اچھے ڈرامے پیش کیے۔ وارث کی کہانی جاگیر دار معاشرے کے گرد گھومتی ہے جو ایک سادہ اور حقیقی کہانی تھی۔ جس کے کردار ہمارے چاروں طرف موجود ہیں۔ وارث جاگیر دارانہ نظام کے نشیب و فراز، دو جاگیر داروں کے مابین دشمنی، بااثر خاندان کے اندرونی جھگڑوں اور اس نظام سے جڑی سیاست کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے جس میں ذاتی مفادات کو ہر رشتے اور ہر شے پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ جس میں بااثر لوگوں کی نفسیات، ذہنیت اور سوچ کو بہت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ امجد اسلام امجد کے ساتھ اصغر ندیم سید، نور الہٰدی شاہ، عبد القادر جونیجو، عطاالحق قاسمی، ڈاکٹر ڈینس آئزک، فضل حسین صمیم اور یونس جاوید جیسے نامور ادیبوں نے ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے لکھے۔ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہو گا کہ اس دور میں ڈراما نگاری کو عروج حاصل ہوا۔ اس زمانے میں ٹی وی ڈراما پورے گھرانے کی تفریح و تعلیم کا باعث تھا۔ سب سے زیادہ ڈرامے سیریلز کی صورت میں پیش ہوئے، پھر سیریز سے زیادہ "طویل دورانیے کے کھیل" ٹیلی ویژن کی پہچان بن گئے۔ جس میں انسانی نفسیات مزید نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

امجد اسلام امجد نے "دہلیز"، "سمندر"، "وقت" اور "رات" جیسے ڈراموں کے کرداروں کی نفسیات کو بہت عمدگی سے پیش کر کے ٹیلی ویژن کو نئی روایت دی۔ اصغر ندیم سید نے "لازوال" (بشریٰ رحمان کے ناول سے ماخوذ)، "دریا"، "آسمان"، "دریچے"، "پیاس" اور "خواہش" کے عنوان سے اچھے ڈرامے لکھے۔ جس میں معاشرے کے متوسط طبقے کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اصغر ندیم سیّد نے بھی اپنے مزاج کے برعکس موضوعاتی ڈرامے لکھے۔ ان کے ڈراموں میں "جہانِ سفر"، "ستارہ اور سمندر"، "جوڑ توڑ"، "احساس"، "چھاؤں" اور "قطار" شامل ہیں۔ ڈاکٹر ڈینس آئزک جو اکثر پشاور سینٹر کے لیے لکھتے تھے، نے "پہلے سی محبت"، "اپنی صلیب" اور "چرن کے پاس" کے عنوان سے ڈرامے تحریر کیے۔ اصغر ندیم سید نے منو بھائی اور انور سجاد کے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈرامے میں روشن خیالی کو جگہ دینے کے ساتھ ساتھ استحصالی معاشرے کے ہتھکنڈوں کو بھی بے نقاب کیا۔ انہوں نے ڈراما خواہش لکھ کر ایک ٹرک ڈرائیور اور اس کی گھریلو زندگی کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ ٹرک ڈرائیور اپنی بیٹی کے عاشق کو قتل کر دیتا ہے اور اس کی شادی اپنے معاون سے کروا دیتا ہے۔

> "یہ کھیل گھریلو انتشار، سماجی عدّم تحفظ، نا انصافی، دوسری شادی سے پیدا ہونے والے مسائل، انسان کی اخلاقی کمزوریوں اور تشنہ کام محبتوں کا احاطہ کرتی ہیں۔"(۲۰)

مستنصر حسین تارڑ نے "پرواز"، "ہزاروں راستے" اور "سورج کے ساتھ ساتھ" سیریلز لکھیں۔ حسینہ معین نے "ان کہی"، "اجنبی"، "تنہائیاں" اور "دھوپ کنارے" لکھ کر پہچان بنائی۔ عبد القادر جونیجو نے "دیواریں"، "چھوٹے بڑے لوگ"، "بدلتے موسم"، "کاروان" اور "سیڑھیاں" کا اضافہ کیا۔ جبکہ نور الہدیٰ شاہ نے "جنگل"، "تپش"، "حوا کی بیٹی"، "آسمان تک دیوار"، "آدم زادے"، "ماروی"، "عجائب خانہ" اور "فاصلے" جیسی سیریلز لکھ کر معاشرتی مسائل کا احاطہ کیا۔ ان سب میں "جنگل" کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ "جنگل" میں سندھ کی وڈیرہ شاہی اور جاگیر دارانہ سماج کو بے نقاب کیا گیا۔ اس ڈرامے میں "نور الہدی شاہ" نے سندھ کی حویلیوں کو ٹیلی ویژن اسٹوڈیو میں لا کھڑا کیا۔ "سمی" میں ہمارے معاشرے کے بہت سے جرائم و مسائل پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس میں 'ونی' جیسے گھناؤنے رواج اور وراثت میں خواتین کی حق

تلفی جیسے جرائم شامل ہیں۔ ڈرامے میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ان مسائل کا شکار مختلف خواتین کس طرح دقیانوسی روایات اور سماجی بندشوں کو توڑتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں اور اپنے حقوق حاصل کرتی ہیں۔

بانو قدسیہ نے "گوشۂ عافیت"، "سہارے"، "صبح کا تارا"، "لب پہ آتی ہے دعا"، "آدھی بات"، "میری ڈائری"، "سراب"، "چٹان پر گھونسلہ"، "زرد گلاب"، "سراب"، "انجانے میں"، "شکایتیں حکایتیں"، "کھل جا سم سم"، "آنکھ مچولی"، "فٹ پاتھ پر گھاس"، "رات گئے" اور "کوئی تو ہو" کے عنوان سے لانگ پلے لکھے۔ بانو قدسیہ کی تحریروں کا بڑا موضوع عورت رہا، لیکن یہ فیمینزم والی عورت نہیں جو مردانہ معاشرے سے بغاوت کر کے اپنی الگ شناخت چاہتی ہو۔ اس کے برعکس بانو قدسیہ نے اپنی تحریروں میں دکھایا ہے کہ عورت اور مرد ایک گاڑی کے دو پہیے ضرور ہیں، لیکن دونوں کا مقام اور کردار متعین ہے۔ ان کے خیال کے مطابق مرد کا کام کفالت ہے، جب کہ عورت کا کام پرورش۔ دونوں کام اس قدر اہم ہیں کہ ان کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان کے ڈراموں کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عائلی زندگی کا بہت باریک بینی سے مشاہدہ کرتی اور اسے عمدگی سے پیش بھی کرتی ہیں۔

منو بھائی نے ڈرامے کا فن کسی کتاب سے نہیں بلکہ اپنے اردگرد چلتے پھرتے اور سانس لیتے کرداروں سے سیکھا تھا، اسی لیے اُن کے تخلیق کردہ کردار کٹھ پتلیوں کے بجائے جیتے جاگتے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ منو بھائی نے "دروازہ"، "ساحل"، "آدھے چہرے"، "گھر سے نکلے"، "مری سادگی دیکھ"، "ڈیڈ لائن"، "آئینہ اور کھڑکی"، "گمشدہ"، "آشیانہ" اور "دشت" جیسے اچھے ڈرامے لکھے۔

سلسلے وار کھیل "آشیانہ" میں انھوں نے خاندانی اقدار کو موضوع بنایا جبکہ "دشت" میں انھوں نے بلوچستان کے صحرائی کلچر پر قلم اٹھایا۔ تاہم سب سے زیادہ مقبولیت اُن کے سلسلہ وار کھیل "سونا چاندی" کو حاصل ہوئی۔ یہ ایک دیہاتی جوڑے کی کہانی ہے جو شہر آ کر مختلف گھروں میں نوکری کرتا ہے۔ ان کے توسط سے شہری زندگی اور معاشرے کے بہت سے نشیب و فراز سامنے آتے ہیں۔ اس میں غریب طبقے کی عائلی زندگی

کو موضوع بنایا گیا۔ نیز ان کی معصومیت اور سادہ طبیعت کو پردہ تصویر پر پیش کیا گیا ہے۔

معاشرتی المیہ طرز کے ڈراموں میں امجد اسلام امجد نے بھی "بازید"، "دکھوں کی چادر"، "اپنے لوگ"، "لیکن"، "شام سے پہلے" اور "فہمیدہ کی کہانی" کے عنوان سے ڈرامے لکھے۔ یونس جاوید نے "کانچ کا پل"، "دھوپ دیوار"، "ساون روپ"، "وادی پر خار"، "پھولوں کا رستہ"، "رگوں میں اندھیرا"، "سٹیٹس" اور "میرا پیغام محبت ہے" جیسے ڈرامے لکھے۔ جمیل ملک نے "دشت تنہائی"، "ہزاروں خواہشیں"، "سچا جھوٹ"، "بے قیمت پانی" اور "تیسرا راستہ" لکھ کر خود کو منوایا۔ انور سجاد نے "رسی کی زنجیر"، "امید باہر"، "پکنک"، "صبا" اور "سمندر" کے عنوان سے لکھا جبکہ حسینہ معین کا ایک کھیل "پانی پہ لکھا تھا" مقبول ہوا۔

ابتدا میں صرف پی ٹی وی کی اجارہ داری تھی، کوئی اور ڈراما بنا ہی نہیں سکتا تھا، ہفتے میں چھ ڈرامے ہوتے تھے۔

روز ایک ڈراما چلتا تھا، چھ کے چھ ڈرامے دیکھے جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ ٹی وی چینلز کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور موضوعات بھی نئے ڈھنگ سے ہمارے سامنے پیش ہونے لگے۔ جمیل ملک کا "مشرق و مغرب"، "جوکر"، "محبت محبت"، "اندر کا آدمی"، "امانت" اور "بے آواز"، شاہد محمود ندیم کا "گواہی"، منو بھائی کا "خوبصورت"، مرزا اطہر بیگ کا "دھند میں راستہ"، "بے نیند راتوں کے خواب"، اصغر ندیم سید کا "سارہ اور عمارہ"، "ملکہ عالم" اور "نشیب و فراز"، ذوالقرنین حیدر کا "جنون کے رنگ"، خالدہ حسین کا "ٹھنڈا پانی"، امر جلیل کا "سناٹا"، فاروق قیصر کا "آئیڈیا" اور خالد محمود زیدی کا "مہمان" مشہور ڈرامے ہیں۔ مزاحیہ ڈراما نگاری میں شاہد محمود ندیم کا "جنجال پورہ"، ایم شریف کا "پانچوں گھی میں"، حامد رانا کا "محلے دار" اور فاروق قیصر کا "سرگم سرگم پھر سرگم" مشہور ہوئے جبکہ "گیسٹ ہاوس"، "شوخئ تحریر"، "کامیڈی تھیٹر" اور "حماقتیں" کے عنوان سے مختلف مصنفین نے کھیل تحریر کیے۔

المختصر ڈراما نگاری کی صنف تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہی ہے اور اس میں نئے نئے موضوعات کا زبردست اضافہ ہو رہا ہے لیکن خالص ادبی ڈرامے آج بھی لکھے جا رہے ہیں۔ اسی طرح یک بابی ڈراموں کا سفر بھی جاری ہے اور مستقبل میں اس کی ترقی اور کامیابی کے امکانات روشن ہیں۔ یعنی کہ اردو ڈراما اردو ادب میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از صبا وحید، لاہور، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت: شام ۵ بجے

۲۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از صبا وحید، لاہور، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت ۵ بجے

۳۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از صبا وحید، لاہور، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت ۵ بجے

۴۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از رشید مصباح: صبح کی دستک، سائبان، لاہور، پندرہ روزہ اخبار

۵۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از صبا وحید، لاہور، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت ۵ بجے

۶۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، طرزِ احساس، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ابتدائیہ

۷۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، آدھے چاند کی رات، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص: ابتدائیہ

۸۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، ادھوری کلیات، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص: ۶۱

۹۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از صبا وحید، لاہور، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت ۵ بجے

۱۰۔ https://www.youtube.com/watch?v=XEba7gr6t-M
۱۵، مارچ ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۰ بجے

۱۱۔ سیّد محمد حسن رضوی، مرتب، ڈرامے پر ایک دقیق نظر، در مطبع مقیدم، آگرہ، ۱۹۰۴ء، ص: ۸

۱۲۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، ادبی کارنامے، کارواں پبلیشرز، آلہ آباد، ۱۹۶۵ء، ص: د

۱۳۔ سیّد محمد حسن رضوی، مرتب، ڈرامے پر ایک دقیق نظر، در مطبع مقیدم، آگرہ، ۱۹۰۴ء، ص: ۹

۱۴۔ عشرت رحمانی، ڈاکٹر، اردو ڈرامے کا ارتقا، علی گڑھ بک ڈپو، علی گڑھ ہند، ص: ۱۹

۱۵۔ ایضاً ص: ۲۰

۱۶۔ عشرت رحمانی، ڈاکٹر، اردو ڈرامے کا ارتقا، علی گڑھ بک ڈپو، علی گڑھ ہند، ص:۲۵

۱۷۔ مسعود حسن رضوی، ادیب، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، انجمنِ ترقی اردو ہند، کتاب نگر، لکھنؤ، ص:۶

۱۸۔ آغا ناصر، آغا ناصر کی یادداشتیں، روزنامہ جنگ سنڈے میگزین، ۱۸ جون، ۲۰۰۲ء

۱۹۔ ریڈرز رپور سکرپٹ سیکشن پی ٹی وی، لاہور، مرکز، ۱۹۹۴ء، بحوالہ محمد طاہر (مقالہ)، ٹیلی ویژن کے اردو ڈرامے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء

۲۰۔ اصغر ندیم سیّد انٹرویو: ۲۵، اکتوبر، ۲۰۰۶ء، بحوالہ محمد طاہر (مقالہ)، ٹیلی ویژن کے اردو ڈرامے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء

باب دوم:

منتخب ڈراموں کا تعارفی خاکہ اور موضوعاتی مطالعہ

الف۔ڈراموں کے تعارفی خاکے

i۔"خدا زمین سے گیا نہیں ہے"

تحریر:اصغر ندیم سیّد

ہدایتکار:کاشف نثار

پیشکش:CRS Public Relations

ڈراما:HUM TV PTV

اقساط:۱۶

نشر:۲۰۰۹ء

موسیقار:راحت علی خان، سارہ چودھری

زبان:اردو(انگریزی اور پشتو زبان کا بھی استعمال ہوا ہے۔)

مناظر:قبائلی علاقوں کے گھر، مدرسے گلیاں اور پاکستان کے مختلف عوامی مقامات

کردار:

ایوب کھوسہ / خائستہ گل ،نعمان اعجاز / زرگل، سارہ چوہدری / پلوشہ ،رشید ناز / رحمان گل، سید جبران / کیپٹن اسفندیار، کیپٹن ذیشان ملک / کیپٹن تیمور، نجیبہ فیض / زرغونے، عائشہ خان / گل بانو، عظیم سجاد / میجر راشد، فیضان خواجہ سلمان / ٹیپو بلال، ارم اختر / ڈاکٹر ماریہ ،کامران مجاہد / دتّا،راشد محمود / مولوی اللہ بخش، طیفور خان / ڈاکٹر شیر جان، صوفیہ خان / عائشہ عامر۔

پاکستان ٹیلی ویژن کا ایک شاہکار ڈراما ہے جسے ملک کے دو بڑے چینلز پر ایک ہی سال نشر کیا گیا،

مرکزی کرداروں میں خائستہ گل، زرگل، رحمان گل، کیپٹن اسفندیار، کیپٹن ذیشان، کیپٹن تیمور، بانو، میجر راشد بلال، ڈاکٹر ماریہ، دتّا، مولوی اللہ بخش، ڈاکٹر شیر جان، صوفیہ خان اور عائشہ شامل ہیں۔

یہ دو بھائیوں کی کہانی ہے۔ جو اپنے والد کی وفات کے بعد غربت کی زندگی بسر کرتے ہوئے الگ الگ راستوں پر نکل پڑتے ہیں۔ خائستہ گل افغانستان کی طرف نکل پڑتا ہے جبکہ رحمان گل پشاور آجاتا ہے۔ رحمان گل تعلیم حاصل کرتا ہے اور کامیاب آدمی بن جاتا ہے۔ رحمان گل کے تین بچے ہیں، جن کے نام ڈاکٹر شیر جان، کیپٹن اسفندیار اور زرغونے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کی پرورش بہت عمدہ انداز میں کرتا ہے، جبکہ دوسری طرف خائستہ گل جہادی لیڈر بن جاتا ہے۔ وہ اپنے بنائے گئے قوانین کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ مذہب کا سہارا لیتا ہے۔ اس نے سرحدی علاقے کے لوگوں کے دماغ اپنے قابو میں کر رکھے ہیں۔ اس کا ایک بیٹا زرگل ہے جو باپ کے اس کام کو آگے چلا رہا ہے۔ اس کی ایک بیٹی پلوشہ ہے جس کو چار دیواری میں غلام بنا کر قید کر دیا جاتا ہے۔ خائستہ گل ایک دہشت گرد بن جاتا ہے۔ نامعلوم ذرائع کے ساتھ مل کر یہ حکومت کے خلاف کام کرتا ہے۔ یہ لوگوں کے ذہنوں کو قابو میں لاتے ہوئے انہیں جنگ پر اُکساتا ہے، اور اپنی مرضی کے مطابق قوانینِ اسلام کی تشریح کرتا ہے۔ خائستہ گل کے بندے عوام کے دلوں میں ڈر اور خوف پیدا کرتے ہیں۔ حکومت کی مخالفت کرتے ہیں، اور گھر سے باہر قدم نکالنے والی عورتوں کو پھانسی دے دیتے ہیں۔ لڑکیوں کی درسگاہوں کو دہشت گردی کا نشانہ بناتے ہوئے ختم کر دیتے ہیں اور عورتوں کے لیے پردے کو لازم قرار دیتے ہیں۔ زرگل بالکل اپنے باپ سے مشابہت رکھتا ہے۔ خائستہ گل اپنے باپ کی ریکارڈ کی ہوئی آواز سنتا ہے جس میں جنت کی بشارت سنائی گئی ہے۔ خائستہ گل اپنے بندوں کو دھماکے کرنے پر جنت کی بشارت دیتا ہے۔ زرگل جنت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور خدا کے بندوں کی صف میں کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ خائستہ گل کا نیٹ ورک بہت بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ جو اللہ بخش کے مدرسے سے شروع ہوتا ہے جہاں پر خودکش بمبار تیار کیے جاتے ہیں۔ ان بمباروں کے دماغوں کو بڑے شاطرانہ طریقے سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اس علاقے کے کچھ لوگوں کو ان پر شک ہوتا ہے اور وہ لوگ جان جاتے ہیں کہ اللہ بخش کے نظریات انتہا پسندانہ ہیں۔ فوج کی بروقت کاروائی سے خودکش بمبار ہلاک ہو جاتے ہیں۔ سرفراز احمد جو غازی کہلاتا ہے، وہ مدرسوں کے چند طالب علموں کو جانتا ہے اور ان کو اپنے تربیتی کیمپ میں لے جاتا ہے، تاکہ ان کی

تربیت مکمل ہو سکے۔ سلمان اور چند کمپیوٹر ماہرین خائستہ گل کو اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ دتّا خود کش بمباری کرنے کے لیے جنت کی راہ ہموار کر لیتا ہے۔ مگر جب اسے سمجھ آجاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو پولیس کو حوالے کر دیتا ہے۔ اس کی گرفتاری سے ڈراما ایک نیا موڑ لیتا ہے۔ پاک فوج ملک دشمن لوگوں کو جلدی پکڑ کر کیفرِ کردار تک پہنچا دیتی ہے۔

پاکستان کی فوج نے بہت عرصے سے دہشت گردی کیخلاف جنگ کا اعلان کیا ہوا ہے "خدا زمین سے گیا نہیں ہے" ایک فرضی مگر حقائق پر مبنی کہانی ہے۔ جس کا مقصد ملک دشمن عناصر اور دہشت گردوں کے خلاف جنگ کا اعلان اور موثر اقدام کرنا ہے۔ پاکستانی فوج خائستہ گل کے علاقوں میں فوجی کارروائی کرتی ہے۔ جہاں فوج کو انتہائی مشکل حالات وواقعات کا سامنا کرنا پڑا۔

اس ڈرامے میں سادگی سے بھرپور بنیادی ضروریاتِ سے عاری زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ ایسے رسم ورواج جو آج بھی ملک کے سرحدی علاقوں میں رائج ہیں، کو پیش کیا گیا ہے۔ عام سادہ، بے بس لوگوں کی زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ یہ قسط وار ڈرامہ تجسس لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ جس میں کشمکش اور ہیجان پایا جاتا ہے۔ اردو ادب میں اتنی مؤثر نوعیت کا المیہ ڈرامہ پہلی بار لکھا اور پیش کیا گیا۔ اس کا موضوع کافی حساس اور سنجیدگی سے پُر ہے۔ ہیجان اور کشمکش کی کیفیت آخر تک برقرار رہتی ہے۔ جس کا انجام اس وقت ہوتا ہے۔ جب خائستہ گل کا اپنا بیٹا زرگل خودکش جیکٹ پہن کر اپنے آپ کو اور پورے گروہ کو مار دیتا ہے۔ کہانی دہشت گردی کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ جس میں قبائلی علاقے اور اس کے مسائل کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ii۔ "تم ہو کہ چپ"

تحریر اصغر ندیم سیّد

ہدایتکار: حسیب حسن

ٹی وی چینل: GEO Entertainment

کل اقساط: ۲۱

نشر:۲۰۰۹ء

پیشکش:خرم رضّا

موسیقار:حمیرا چنّا

زبان:اردو(انگریزی اور پشتو زبان کے الفاظ اور جملوں کا استعمال کیا گیا ہے)

مناظر:حویلی کے مناظر، قبائلی علاقے اور لندن کی جامعہ

کردار: عابد علی / سردار جمال خان ،حنا خواجہ بیات /بی بی جانم، ہمایوں سعید / میر ضرار خان، عائشہ خان / مشل، فضہ علی / پری وش تحریم زبیری / بی بی زیتون، زیبا علی / بی بی گل بانو، حنا دلپذیر / سائزن بی بی، سید جبران / نومی، فیصل / بیر بل، زرار خان / سکندر، شہروز سبزواری / ذیشان۔

"تم ہو کہ چپ" ڈراما اپنے اندر ایک وسیع گہرا پیغام لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ ظلم کو برداشت کرنے والا ظالم کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔ اس کہانی میں تجسس اور ہیجان کی کیفیت پائی جاتی ہے، ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو ایک دوسری عورت کی مدد کرتی ہے۔ اہم کرداروں میں سردار جمال خان، بی بی جانم، مشل، میر ضرار، بی بی زیتون، پری وش، بیر بل، سکندر اور ذیشان شامل ہیں۔ مشل جو ایک غیر ملکی مگر پاکستان سے تعلق رکھنے والی لڑکی ہے۔ آزاد ماحول کی پروردہ اس لڑکی کے والدین ڈاکٹر ہیں، یہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ مشل کا دوست سکندر اس کو پسند کرتا ہے مگر مشل اس کو یہ کہہ کر خود سے دور کر دیتی ہے کہ ڈرپوک آدمی کبھی محبت نہیں کر سکتا۔ یونیورسٹی میں مشل کی ملاقات میر ضرار سے ہو جاتی ہے۔ جو قبائلی علاقے کے سردار کا بیٹا ہے۔ مشل کو یہ لگتا ہے کہ اس نے اپنے خوابوں کے شہزادے کو پالیا ہے۔ میر ضرار اور مشل جلد ہی شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ جس کے بعد مشل پاکستان جانے کی ضد کرتی ہے۔ پاکستان کے کلچر کو قریب سے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ جب وہ پاکستان پہنچتی ہے تو اسے سب سے بڑا دھچکا یہ لگتا ہے جب میر ضرار اسے ہجوم میں اپنے چہرے کو ڈھانپنے کا حکم دیتا ہے۔ مشل کو یہ لگتا ہے کہ یہ حکم وقتی ہے اور وہ ادھر صرف چھٹیاں گزارنے کے لیے آئی ہے۔ اس کی سب سے پہلی ملاقات بی بی جانم سے ہوتی ہے۔ جو ایرانی خاتون ہے۔ مشل اس بات سے حیران ہوتی ہے، کہ میر ضرار کی ایک اور سوتیلی ماں بھی ہے ۔جو انہی کے قبیلے سے تعلق رکھنے والی ایک نوجوان لڑکی ہے۔ مشل بی بی جانم سے دوستی کر لیتی ہے۔ اپنی بہن

کو سردار جمال خان نے باندی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ مشل ادھر کا کلچر اور رنگ برنگ کے روایتی لباس زیورات کو دیکھ کر سب کچھ بھول جاتی ہے۔ مگر اس سب سے بہت جلد اکتا جاتی ہے۔ جب وہ اپنا فون استعمال کرنا چاہتی ہے تو ضرار کہتا ہے کہ فون میں جیمرز لگے ہوئے ہیں، تاکہ دشمنوں سے تمہاری حفاظت کی جاسکے۔ بہت جلد مشل کو یہاں کے قبائلی وحشیانہ طرزِ زندگی کا علم ہو جاتا ہے۔ یہاں کے سردار لوگوں پر حکمرانی کرتے ہیں اور لوگ قبائلی نظام کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ بے گناہوں کو سزائیں دی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب مشل کو علم ہوتا ہے کہ ضرار کے ماں باپ دونوں ہی بیرون ملک سے تعلیم حاصل کر چکے ہیں تو وہ مزید صدمے سے دوچار ہو جاتی ہے۔ مشل کو جب علم ہوتا ہے کہ ضرار پہلے سے شادی شدہ ہے تو اس کا غم وغصے سے برا حال ہوتا ہے۔ ضرار کی پہلی بیوی بانو مشل کو زہر دینے کی کوشش کرتی ہے۔ تو میر ضرار اس کو قید خانے میں ڈلوا دیتا ہے۔ مشل کو بہت جلد علم ہو جاتا ہے کہ وہ بہت آسانی سے بے وقوف بن گئی ہے۔ مشل جب ماں بننے والی ہوتی ہے، تو اس کو اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس کو بری طرح پھنسا دیا گیا ہے اور وہ ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ سردار جمال خان دوسرے قبیلے کی لڑکی کو پناہ دیتا ہے جو بیر بل نامی لڑکے کو پسند کرتی ہے۔ مگر سردار اس لڑکی کو اپنی تیسری بیوی بنالیتا ہے۔ مشل کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ پری وش کسی کو پسند کرتی ہے۔ مشل اس پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز تو اٹھاتی ہے مگر اس کی آواز حویلی کی دیواروں میں دب جاتی ہے۔ بیر بل کسی طرح سردار کے پاس کام پر لگ جاتا ہے۔ پری وش اور مشل کو اپنے ساتھ بھاگ جانے کے لیے راضی کر لیتا ہے مشل اس معاملے میں پری وش کی مدد کرتی ہے۔ مشل ان کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کرتی ہے مگر پکڑی جاتی ہے اس کے بعد اس پر پہرے سخت کر دیے جاتے ہیں۔ جس سے وہ مزید پریشان ہو جاتی ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد وہ پھر بغاوت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس وقت بی بی جانم کو اس پر ترس آجاتا ہے وہ اس کو حویلی کے خفیہ راستے سے بھگا دیتی ہے۔ کافی کوششوں کی ناکامی کے بعد مشل یہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو جاتی ہے مگر وہاں بھی سردار اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور اس کو زندگی بھر شادی نہ کرنے کا حکم سناتا ہے۔ پری وش کو سردار طلاق دے کر باندی بنا کر اپنے پاس قید کر لیتا ہے۔ سردار جمال بی بی جانم کو مشل کو بھگانے پر زندہ درگور کرنے کی سزا سناتا ہے۔ ضرار اپنے باپ کی منت کرتا ہے۔ مگر سردار جمال اپنے کان بند کر لیتا ہے اور بی بی جانم کو زندہ قبر میں اتروا دیتا ہے۔ ضرار

کو ماں کے مرنے کے بعد اپنی شکست اور کمزوری کا بڑی شدت سے خیال ہوتا ہے۔ جس کے بعد وہ صدمے سے دوچار ہو جاتا ہے۔ دشمن اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ یوں سردار نے ظلم کا جو عمل اپنی حاکمیت اور رعب کو قائم رکھنے کے لیے اپنایا تھا وہ اسی پر الٹا پڑ جاتا ہے۔ سردار جوان بیٹے کی موت کا صدمہ سہہ نہیں پاتا ہے اور مفلوج ہو جاتا ہے اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد سردار کی سرداری حویلی کی دیواروں سے سر ٹکراتی ہے۔ بیس سال بعد مشل اسی جگہ واپس جانے کا فیصلہ کرتی ہے، جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کا سردار مر گیا ہے اور کوئی نظام چلانے والا نہیں رہا تو وہ وہاں کا ماحول بدلنے کے لیے بیٹے کے ساتھ جاتی ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ میرا بیٹا اس جگہ کو اور اس نظام کو بدل دے گا اور لوگ اس تبدیلی کو قبول کر لیں گے۔ کہانی قبائلی علاقے کی ہے۔ جس میں ان کے رہن سہن، رسم و رواج کی خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ سرداری نظام اور جاگیر درانہ نظام کو پیش کیا گیا ہے نیز ادھر کے روایتی ظلم کو دکھایا گیا ہے۔

iii۔ "دل تو بھٹکے گا"

تحریر: اصغر ندیم سیّد

ہدایتکار: حسیب حسن

چینل: GEO Entertainment

پیشکش: geo special project

موسیقار: بشریٰ انصاری

اقساط: ۱۵

نشر: ۲۰۱۱ء

زبان: اردو

مناظر: حویلی اور شہر

کردار: ریشم / یاسمین، سہیل اصغر / ٹھاکر (باپ)، محب مرزا / شمائل، اعجاز اسلم / بلاول، نتاشہ علی / حسن بانو، شمعون عباسی / ملازم جان، ایمن طارق / ملازمہ شمو، اسد ملک / سجاول، صبا فیصل / ماں، مہوش حیات /

صوفیہ

"دل تو بھٹکے گا" ڈراما اپنے عنوان کے اعتبار سے دلکش اور پر کشش معلوم ہوتا ہے۔ ڈراما حویلی کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ جس کی کہانی طاقتور خاندان کے گرد گھومتی ہے۔ جس میں نام نہاد ناجائز رشتے اور عورت کے احساسات وجذبات کو پیش کیا گیا ہے۔ ناجائز تعلقات کا موضوع ایک ایسا مشکل موضوع ہے۔ جس پر بات کرنا آسان نہیں۔ ڈراما تین بھائیوں اور ان کی بیویوں کی کہانی کو پیش کرتا ہے۔ یاسمین کا شوہر اس کو پسند نہیں کرتا۔ یاسمین اپنی بے قدری پر روتی ہے۔ کہانی اس وقت نیا موڑ لیتی ہے جب بڑا بھائی یعنی یاسمین کا شوہر سڑک حادثے میں مر جاتا ہے، اور اس کی بیوی اکیلی رہ جاتی ہے۔ افراد خانہ ریشم کی شادی دیور سے کروانا چاہتے ہیں تاکہ اس کی جائیداد کو گھر میں رکھ لیا جائے۔ لیکن کہانی اس وقت ایک نیا موڑ لیتی ہے جب وہ اپنے ملازم کے بچے کو جنم دیتی ہے۔ ریشم کا کردار مرکزی کردار ہے۔ مگر اس کا کردار ایک کمزور کردار ہے۔ نتاشہ حسن بانو کا کردار بہت پر کشش کردار ہے۔ جس کے باعث کہانی میں بدلاؤ آتا ہے۔ حسن بانو یاسمین کے شوہر کو قابو رکھنے کے گر سکھاتی ہے مگر یاسمین سیکھنے اور عمل کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ یاسمین شوہر کے بعد اپنے جذبوں کی تسکین کے لیے ملازم کا سہارا لیتی ہے اور جب ملازم کے بچے کو جنم دیتی ہے تو گھر میں طوفان آجاتا ہے۔ ٹھاکر اس کو زندہ دفن کرنے کا حکم سناتا ہے۔ مگر دیور شمائل اس کا دکھ سمجھتے ہوئے اس کو شہر لے جاتا ہے اور اس سے نکاح کر لیتا ہے۔ کہانی کا اختتام تو خوشگوار ہو جاتا ہے۔ مگر حسن بانو کو لالچ کی وجہ سے گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کہانی میں عورت اور اس کی نفسیات کو بہت عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے ایک ایسا موضوع جو اصغر ندیم سید نے احسن طریقے سے پردہ تصویر پر پیش کیا ہے۔ جس میں عورت کے داخلی مسائل کو سامنے لایا گیا ہے۔

iv۔ "بول میری مچھلی"

تحریر: اصغر ندیم سیّد

ہدایتکار: حسیب حسن

پیشکش: اقبال انصاری

چینل:GEO Entertainment

اقساط:۲۸

نشر:۲۰۱۲ء

زبان:اردو نیز انگریزی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے

مناظر:پاکستان کا شہر کراچی،گھر،ہوٹل،جامعہ،گلیاں اور سڑکیں۔

موسیقار:شبنم مجید

کردار:طوبیٰ صدیقی / نورین(نوری)،عائشہ خان / سحاب، تحریم زبیری / رباب،ثمینہ احمد / ماں، سعدیہ شیخ /ماہین ، فہد مصطفیٰ/ شیراز، شہود علوی / مجاز صدیقی، جاوید شیخ / بزنس مین , مظہر علی پروفیسر وحید (باپ)بہروز سبزواری۔ سمیع خان / عمران

بول میری مچھلی ڈرامے کے نام کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ:

"بول میری مچھلی اور تم ہو کہ چپ،ڈراموں کے نام میں نے تجویز نہیں کیے تھے۔ یہ جیو کی سپیشل پروڈکشن یونٹ نے بنائے تھے۔"(۱)

اس ڈرامے کی کہانی ایک ایماندار منکسر المزاج پروفیسر وحید اور اس کی چار بیٹیوں پر مبنی ہے۔ پروفیسر وحید اور اس کے گھرانے کا تعلق متوسط غریب طبقے سے ہے۔ وحید اپنی بیٹیوں کو بہتر سے بہتر زندگی دینا چاہتا ہے اور ان کے مستقبل کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہے۔ جس کے لیے اپنی بیٹیوں کو آزادانہ ماحول مہیا کرتا ہے ،کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کرتا۔ رباب، سحاب، نورین اور ماہین چاروں اپنے اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگتی ہیں ۔ مگر ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ خواب ان کے لیے سراب بن جائیں گے۔ وہ اس بات سے لاعلم رہتی ہیں کہ گھر کی چار دیواری ہمیں تحفظ دیتی ہے، جبکہ باہر کا ماحول ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے ہم سے تحفظ، اعتبار، یقین، عزت سب کچھ چھین لیتا ہے۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو سامنے لاتی ہے۔ رباب جو کہ پروفیسر کی بڑی بیٹی ہے۔ ایک شاعر مجاز صدیقی کو پسند کرنے لگ جاتی ہے۔ مجاز رباب کی کم عمری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے تعلق قائم کرتا ہے اور اس کے بعد اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ رباب تو مر جاتی ہے، لیکن اپنے پیچھے ایک نئی کہانی چھوڑ جاتی ہے ۔ مجاز صدیقی اس معاشرے کا بگڑا ہوا ایک کردار ہے جو لڑکیوں میں دلچسپی

رکھتا ہے اور ہر روز ایک نئی لڑکی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مجاز صدیقی کے کردار کے ذریعے ہمیں معصومیت کے پیچھے چھپے بھیانک چہرے نظر آتے ہیں۔ مجاز صدیقی رباب کے بعد سحاب کو اپنی محبت کے جال میں پھنسالیتا ہے ۔ سحاب بھی اس کی باتوں میں آجاتی ہے اور اس سے شادی کر لیتی ہے۔ سحاب شادی کے بعد خوش نہیں رہتی اور بہت جلد اس کے سامنے مجاز کا اصل چہرہ آجاتا ہے۔ دوسری طرف ماہین باپ کی معاشی مدد کرنے کے لیے ماڈلنگ کی راہ چنتی ہے۔ اپنے حسن کی قیمت وصول کرتی اور اپنی عزت نیلام کر دیتی ہے۔ قیمت لگانے والے اس کو بہت بڑی رقم ادا کرتے ہیں۔ نورین کے پاس پچھتاؤں کے علاوہ کچھ نہیں رہتا، مگر اس کی جامعہ کا دوست اس کی زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیتا ہے۔

اس ڈرامے میں مرکزی کردار کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ ڈراما بہت سے کرداروں کے گرد گھومتا اور اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامے کے حوالے سے جب محقق نے ڈراما نگار سے سوال کیا کہ اس میں مرکزی کردار یا ہیرو ہیروئن کا اندازہ لگانا مشکل ہے تو انہوں نے کہا۔

> ”ٹی وی ڈراموں یا سیریلز میں ہیرو ہیروئن نہیں ہوتے۔ یہ صرف ہماری فلموں میں ہوتے ہیں۔ ڈراموں میں مرکزی کردار ہوتے ہیں ثانوی یا چھوٹے کردار ۔ اس لیے آج تک ٹیلی ویژن نے ہیروئن یا ہیرو پیدا نہیں کیے، فن کار پیدا کیے۔ میرے اس سیریلز میں یہ کردار مرکزی حیثیت کے حامل تھے۔ سب کا اپنا نقطہ نظر تھا سب کا اپنا conflict تھا لوگ سب کو یکساں توجہ سے دیکھتے تھے۔“(۲)

کہانی عام متوسط طبقے کی کہانی ہے جو معاشی بحران کا شکار ہے۔ جس میں بیٹیوں کو بے جا آزادی دینے کے نقصانات بتائے گئے ہیں اور معاشرتی برائیوں کو سامنے لایا گیا ہے۔

ب۔ منتخب ڈراموں کا موضوعاتی مطالعہ

کسی بھی فن سے تعلق رکھنے والا زندگی کی حقیقتوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا کیوں کہ فن اور زندگی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے۔ انسانی زندگی سے جڑے تمام اجزائے ترکیبی اور کائنات کے مسائل فن کار کا موضوع ہو سکتے ہیں۔ اس ضمن میں جہاں تک ڈراما نگاری کا تعلق ہے تو ڈراما نگار اپنے اردگرد جن چیزوں کو دیکھتا

اور مشاہدہ کرتا ہے۔ ان کو اپنے ڈرامے کا موضوع بنالیتا ہے۔ اسی باعث آج ڈراما موضوع کے اعتبار سے خاصا زرخیز ثابت ہوا ہے۔ آج ڈراما خارج سے داخل کی طرف بڑھتے ہوئے زندگی سے وابستہ مسائل کا احاطہ کرتا نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر مہناز انور:

> "۔۔۔۔۔۔ مسائل اور نئے نئے امکانات سے انسان واقف ہوتا جارہا ہے۔ علم و ادب سائنس اور ٹیکنالوجی پر انسان کی بھرپور گرفت نے بہت ساری ایجادات کی ہیں جس سے افسانہ نگار اور اس دور کے دانشور بھی متاثر ہوئے۔ انہوں نے ایٹم بم اور انسانی کوشش کے چاند تک پہنچ جانے کو بھی موضوع افسانہ بنایا۔"(۳)

موضوع کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کسی بھی فن پارے میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ فنکار اپنی تخلیق کی بنیاد اسی پر رکھتا ہے۔ تخلیق اسی وقت پائیدار ہوتی ہے جب اس تخلیق کی بنیاد انسانی زندگی سے جڑی ہوگی۔ لہٰذا ڈراما نگاروں نے اس بات کی بھرپور کوشش کی ہے کہ وہ انسانی زندگی کی تمام وسعتوں کو اپنے ڈرامے میں جگہ دیں۔ ڈرامے کا کوئی مخصوص موضوع نہیں ہوتا۔ انسانی حادثات واقعات، احساسات، جذبات اور تجربات ہی موضوع بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اصغر ندیم سیّد نے ڈراموں کے موضوعات کو خاصا دلچسپ بنایا ہے۔ زندگی کو دیکھنے کا نظریہ ان کے ہاں خاصا مختلف ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے نئے موضوعات کو اپنے ڈراموں میں برتا ہے، بے شک پرانے موضوعات کو ہی ڈراموں میں جگہ دی ہے مگر ان کو پیش الگ اور اچھوتے انداز میں کیا ہے۔ وہ حال، ماضی اور مستقبل کے مشاہدات کو ڈرامائی قالب عطا کرتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کے دلچسپ موضوعات ان کی گہری فکر کو ثابت کرتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کے موضوعات دلچسپ اور سادہ ہیں۔ تحقیق کے حوالے سے منتخب کردہ ڈراموں میں بھی مختلف قسم کے موضوعات ملتے ہیں۔ جن کا پرکھنا اور تجزیہ کرنا بہت ضروری ہے۔

i۔ جاگیردارانہ نظام اور رسم ورواج

انسان کی ابتدا پتھر کے زمانے سے ہوئی۔ انسان کے ابتدائی دور اور آج کے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انسان نے بہت تیزی سے ترقی کی منازل طے کیں اور آج انسانی معاشرت موجودہ شکل میں موجود ہے۔

ترقی کے یہ مدارج رکے نہیں بلکہ آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ مگر اس تبدیلی کے باوجود آج بھی کچھ علاقوں میں ایسے پرانے نظام رائج ہیں جو تنگ ذہن انسان اپنے گلے سے لگائے ہوئے ہے۔ ان میں سے ایک جاگیر دارانہ نظام (فیوڈالزم) بھی ہے۔ **بقول ڈاکٹر مبارک علی:**

> "فیوڈل ازم کا لفظ feu یا feudum سے نکلا ہے یہ ایک جائیداد کی شکل تھی کہ جس کا ذکر کرو ستا کے قانون کی کتابوں میں ہے ۔ فرانسیسی زبان میں یہ لفظ فیوں دالتے feudalite ہو گیا۔ اس سے پہلے اس مفہوم کو "فیف" کہا جاتا تھا۔ ولیم فاتح (۱۰۶۶-۱۱۳۵) نے جب انگلستان کو فتح کیا اور اپنے سُرماویں جاگیریں تقسیم کی تو وہ زمین فرانسیسی میں **فیس** کہلاتی تھی۔ جس میں یہ معاہدہ ہوتا تھا کہ فیس رکھنے والا بادشاہ کو سپاہی اور گھوڑے فراہم کرے گا۔ اس قسم کی جاگیر فوجی خدمت کے عوض دی جاتی تھی۔"(۴)

جاگیر دارانہ نظام میں جمہوری حکومت کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ علاقے کے بڑے زمینداروں کو اجازت تھی کہ وہ اپنے اپنے علاقے کے مزدور طبقے سے خراج اور ٹیکس وصول کرتے رہیں اور اپنے علاقے میں جیسے چاہیں حکومت کرتے رہیں مگر حکومت کو ایک خطیر رقم بھی ادا کرتے رہیں۔ سب سے زیادہ مجبور کسان تھا۔ یہی وہ جاگیر دار تھے۔ جو ظلم کی داستانیں رقم کرتے تھے۔ ان کی طاقت کمزور طبقہ کو زیر کرنے میں تھی۔ یہ کسان مزدور کو اپنے زیر تسلط رکھ کر کام لیتے تھے۔ اس کے باعث ہی طبقاتی کشمکش کو بڑھاوا ملا۔ مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہر ملک میں ایک ہی جیسی حالت میں پایا جاتا ہے۔ یورپ میں فیوڈل ازم رشتوں کی غلامی کے باعث پیدا ہوا۔ جرمن قبیلوں میں زراعت کے نظام نے اس کو پیدا کیا۔ ہندوستان میں فیوڈل ازم کی بنیاد ریاستی جاگیری نظام نے ڈالی، مسلمانوں نے بھی اس چیز کو بہت بڑھاوا دیا۔ بقول ڈاکٹر مبارک علی:

> "مسلمان حکمرانوں نے فتح کے بعد ہندوستان کے انتظامی ڈھانچے کو اسی طرح برقرار رکھا اور ہندو زمیندار نے مالیہ وصول کر کے حکومت تک پہنچایا یہ ہندو زمیندار موروثی تھے اور اپنے اختیارات کی وجہ سے حکومت کے حکمرانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا یہ زمیندار مقدم چوہدری رائے اور رانا کہلاتے تھے اور گاؤں دیہاتوں میں ان کی

حکومت تھی، یہ سلطان کے ساتھ اس وقت تک وفادار رہتے تھے جب تک اس کے پاس طاقت ہوتی تھی۔ مرکز کی ذرا سی کمزوری دیکھ کر یہ بغاوت کر دیتے تھے اور حکومت کی رقم حکومت کو ادا نہیں کرتے تھے۔"(۵)

برصغیر میں جاگیر داری نظام تین ادوار بالترتیب مسلمانوں کی آمد سے پہلے مسلم حکمرانوں کا عہد اور برطانوی اقتدار کے زمانے پر مشتمل ہے۔ شروع میں خطہ زمین کے آبادکاروں میں زمین منتقل ہوتی رہی تھی۔ جب بادشاہی نظام رائج ہوا تو حکمرانوں نے زمین قبضے میں لے لی اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے مفاد کی خاطر لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ زیادہ زمین (جاگیر) رکھنے والا طبقہ، غلاموں پر قابض ہوتا چلا گیا۔ جاگیر دار حکومتی عہدیداروں کے منہ بند رکھنے کے لیے ان کو بھی ایک خطیر رقم ادا کرتے تھے۔ اس سارے نظام میں جو سب سے زیادہ مظلوم طبقہ تھا وہ ہندوستان کا کسان تھا۔ شاہی نظام میں بادشاہ جاگیر دار کو جاگیر دے کر اس کی وفاداری خریدتا تھا۔ اس طرح جاگیر دار بادشاہ کو رقم ادا کرتا اور بادشاہ اور جاگیر دار دونوں فائدے میں رہتے تھے۔ **بقول نعمان صدیقی:**

"جاگیر دار بتول دار بھی کہلاتے تھے شاہی خاندان کے جن افراد کو جاگیریں دی جاتی تھیں۔ یہ بتول دار سرکاری دولت مدار کہلاتے تھے۔ چونکہ جاگیر تنخواہ کے عوض دی جاتی تھی اس لیے جاگیر تنخواہ جاگیر نہ جاگیر کہلاتی تھی۔ وہ جاگیر کے جن کے ساتھ کوئی شرط نہیں ہوتی تھی وہ انعام کہلاتی تھی، پر وہ جاگیر جو کسی کو دے دی گئی ہوتی تھی مگر وقتی طور پر اس کی نگرانی بادشاہ کے ملازمین کر رہے ہوتے تھے وہ "پائے باقی" کہلاتی تھی "خالصہ جاگیر" بادشاہ اور شاہی خاندان کے اخراجات کے لیے ہوتی تھی یہ وقت اور حالات کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی بادشاہ اکثر زرخیز اور اچھے علاقوں کو خالصہ جاگیر میں شامل کر لیا کرتا تھا مگر جب ضرورت پڑتی تھی تو اس میں سے پہلے منصب داروں کو بھی دے دی جاتی تھی۔"(۶)

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد ہوئی تو انہوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے یہاں پر کمپنی کا قیام عمل میں لایا۔ قابض ہونے کے لیے اراضی حاصل کی اور ہندوستان کی عوام کے لیے کام انجام دیے۔ اس سے

انگریز مزید طاقتور ہو گئے۔ جاگیر داری نظام کو مضبوط بنانے کے لیے انگریزوں نے کافی غور و خوص سے کام لیا ۔ انہوں نے حکومتی نظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جاگیر دار طبقے کو بھی ساتھ ملا لیا۔ جاگیر داروں کے بچے سکول جانا پسند نہیں کرتے تھے وہ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے اعلیٰ و برتر خیال کرتے تھے۔ جاگیر دار نوکری کو معیوب سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ تعلیم کو بھی ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ جاگیر داروں نے اپنے بچوں کے لیے اعلیٰ تعلیمی ادارے مختص کر لیے۔ ان کو دوسرے ملک بھیجا جاتا تھا۔ تعلیم نے اس طبقے کے طور طریقے بدل دیے۔ ان کے رنگ ڈھنگ میں رفتہ رفتہ تبدیلی آتی گئی۔ ان کے اندر کا درندہ جو مظلوم طبقے پر ظلم ڈھاتا تھا پردے میں چھپ گیا۔ فیوڈلز خود کو ماورائی مخلوق سمجھتے تھے۔ وہ اپنے خاندان سے باہر شادی نہ کرتے تھے چاہے کتنے ہی بے جوڑ رشتے بنانے پڑ جاتے۔ خاندانی روایات و رسومات کو جان سے بڑھ کر عزیز سمجھا جاتا تھا۔ عورت کی عزت نہ تھی، بلکہ اس کو گھر حویلی کی چار دیواری میں مقید رکھا جاتا تھا۔ جو عورت خاندان کو وارث دیتی اس کی قدر ہوتی۔ جاگیر داروں کے بچوں کو شروع سے ہی ملازمین کو حکم دینے کی عادت ہوتی۔ گھر کا سربراہ مرد ہوتا بلکہ علاقے کا نظام بھی اسی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ عمارہ طارق لکھتے ہیں کہ:

> "یہ معاشرتی اور معاشی نظام اپنے ایک مخصوص سیاسی نظام کو جنم دیتا ہے اگر معاشرتی اور معاشی نظام اور سیاسی نظام اس سے الگ نہیں دیکھتا ہوں تو ان میں سے ایک نظام دوسرے کو کھا جائے گا، چنانچہ ہمارے یہاں جاگیر داری نظام جمہوری نظام کو بار بار کھاتا چلا جا رہا ہے یہ دونوں نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔"(۷)

اسی نظام کے تحت طبقاتی تقسیم کو اور بڑھاوا ملا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کا جمہوری نظام بھی فیوڈل ازم کے تابع نظر آتا ہے۔ ہمیں جو نظام برصغیر پاک و ہند میں نظر آتا تھا وہی نظام پاکستان میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ آج بھی ہمیں پاکستان کے قبائلی علاقوں میں یہ نظام پورے طمطراق سے براجمان نظر آتا ہے۔ ادب میں بھی اس کی مختلف صورتیں دکھائی گئی ہیں۔ جاگیر داری نظام کی وہ تصویر جو برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے پہلے کی ہے بلکہ اب کی بھی تصویریں ادب میں جابجا بکھری نظر آتی ہیں۔ ناول، افسانہ اور داستان سب میں جاگیر داری نظام اور اس کی رسوم کی جھلک نظر آتی ہیں اور ڈراموں میں بھی اس کی واضح تصویر پیش کی گئی ہے۔ پاکستانی اردو ڈرامے جو پی ٹی وی پر دکھائی دیتے ہیں، سماجی موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان موضوعات میں ہر

طرح کا معاشرتی موضوع نظر آتا ہے مگر جاگیر دارانہ نظام کے تحت لکھے جانے والے ڈراموں کا ایک رواج چل نکلا ہے۔ اس موضوع کے تحت لکھے جانے والے ڈراموں میں یہ ڈرامے شامل ہیں۔

- پیاس، اصغر ندیم سید
- دن، امجد اسلام امجد
- صدوری، کفایت رودینی
- ماروی، نورالہدیٰ شاہ
- راہیں، منشایاد
- نوری، جام تماچی
- ہوائی، اصغر ندیم سید
- سمی، نورالہدیٰ شاہ
- وارث، امجد اسلام امجد

اصغر ندیم سید دنیاوی فطرت کا گہرا جذباتی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس مطالعے میں انہوں نے معاشرے سے بہت سے موضوعات اٹھائے ہیں اور انہی موضوعات کو انہوں نے اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے۔ ان موضوعات کی بدولت ہمیں معاشرے کی اصل تصویر دکھائی دیتی ہے۔ معاشرے کے اہم موضوعات کو بیان کرنا ان کا فطری میلان ہے۔ وہ معاشرتی بے راہ روی اور اردگرد کے ماحول سے مجبور ہو کر اپنے موضوعات کو پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے ڈراموں کے ذریعے معاشرے کے کئی رخ سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

قبائلی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے قبائلی افراد دیگر تمام اقوام سے الگ پہچان رکھتے ہیں۔ قبائلی اقوام کے رسم و رواج میں سب سے اول ان کے جھگڑے ہی رہے ہیں۔ ان کی خونریزیوں نے قبائلی علاقوں میں تعلیم و تربیت اور معاشی ترقی کے فقدان کو بڑھاوا دیا ہے۔ ایسی ہی تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں میرے منتخب کردہ ڈراموں میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں ڈراما نگار جدید رویے، انقلاب اور تحریک سے لے کر ثقافت اور تہذیب سے روشناس کرواتے ہیں۔ ہمیں حال و ماضی میں جکڑ کر مستقبل کا سراغ دیتے ہیں۔ انھیں ڈراموں کی مدد سے ہی ہم نہ صرف قبائلی علاقوں کے رسم و رواج کو عملی طور پر دیکھ سکتے ہیں بلکہ کسی اور مذہب فرقے اور

زبان کے رسم ورواج سے آگاہی حاصل کرسکتے ہیں۔ان ڈراموں کی مدد سے بھی بہت سے ایسے رسم ورواج سے آگاہی ملتی ہے جو عام آدمی کی معلومات کا حصہ نہیں ہیں۔ ''خدا زمین سے گیا نہیں ہے'' اور ''تم ہو کہ چپ'' سے ہمیں نہ صرف بلوچ قبائل کے رسم ورواج اور رہن سہن سے آگاہی ملتی ہے بلکہ ان کی اقدار اور طرز واطوار ان کے ذہن پسماندگی کی عکاسی بھی بھرپور طریقے سے کرتی ہیں۔ڈراموں کے تجزیے سے پتہ چلتاہے کہ وہ کون سی وجوہات ومحرکات تھے جو پڑھے لکھے افراد کو بدل نہیں سکے۔

ڈراما **"خدا زمین سے گیا نہیں ہے"** میں خائستہ گل کا کردار ایک خاص طبقے پر حاکم ہے۔ اس نے اپنی بیٹی پلوشہ کو گھر میں نظر بند کرکے رکھاہوا ہے۔اسی وجہ سے جب اس کی بیٹی راہِ فرار اختیار کرلیتی ہے تو وہ بھوکا شیر بن کر خودکش دھماکوں کے ذریعے اپنا بدلہ لیتاہے۔اس ڈرامے میں جاگیرداری نظام کی واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ سردار نہ صرف اپنے گھر کی عورتوں پر ظلم کرتا بلکہ اپنے علاقے کے لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔ وہ ملک دشمن عناصر کے ساتھ مل کر لوگوں کو شہر سے اغوا کرواتا ہے اور حکومت سے ان کا تاوان وصول کرتا ہے، اس کا یہ عمل پورے ملک کے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس نے علاقے مختص کیے ہوئے ہیں جن پر صرف اس کی حکومت ہے اور اسی کا راج چلتا ہے۔

اس موضوع کے حوالے سے ان کا دوسرا اہم ڈراما جو میں نے منتخب کیا ہے وہ **"تم ہو کہ چپ"** ہے۔ یہ بھی اس جاگیردارانہ نظام کی اہم کڑی ہے جس میں اس نظام اور ضمیر فروش افراد کی داستان رقم کردی گئی ہے۔ جاگیردار اپنی جائیداد کو اور گھروں میں غیر انسانی عادات وخصائل کو نسل در نسل منتقل کرتا چلا جاتا ہے۔اس ڈرامے میں اس نظام کی واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ سردار جمال خان جو اس نظام کا پروردہ ہے، پڑھا لکھا اور باشعور ہونے کے باوجود اپنی اولاد میں بھی یہی عادات ڈالتا ہے اور اس نظام کو مزید مستحکم کرتا چلا جاتا ہے۔ اس نظام کی وجہ سے ہی وہ کئی ہنستی بستی لڑکیوں کی زندگی برباد کرتا ہے اور نہیں موت کے دہانے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اس سوچ کے باعث بی بی سائیزن (سردار جمال خان کی بہن) کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا ہے کہ وہ کہیں جائیداد میں حصہ دار نہ بن جائے اور وہ اپنی پسند کی شادی نہ کرلے۔ لڑکی کو پسند کی شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔اگر ایسا ہو جائے تو اس کو بھیانک سزا دی جاتی ہے۔ یہاں کا رواج ہے کہ کوئی لڑکی کسی لڑکے کو پسند نہیں کرسکتی۔ پری وش اور سائزن بی بی دونوں کو قید خانے میں زنجیروں میں جکڑ کر قید کیا جاتا

ہے۔ کرداروں کے الفاظ اور مکالمے ہمیں باور کرواتے ہیں کہ وہ کس طرح سے ان رسوم و رواج کے خلاف ہیں۔ جب برائی کا خاتمہ ہونے لگتا ہے تو گونگوں کو بھی زبان مل جاتی ہے۔ سائیزن بی بی کے یہ الفاظ ہمیں ان کی رسم ورواج سے نفرت کو واضح کرتے ہیں۔ "سائیزن بی بی: بی بی جانم کی اللہ نے سن لی اب تمہارا رسم ورواج مٹی میں مل جائے گا تمہارا پگڑیاں تار تار ہو گا۔"(۸) جاگیر دارانہ نظام اور رسم و رواج کے نام پر عورت تا عمر پستی رہی۔

قبائلی علاقوں میں مختلف قسم کے مقابلے کروانے کا بھی عام رواج ہے۔ اس ڈرامے میں روایتی کُکڑ مقابلہ بھی کروایا گیا جو اس علاقے کے خاص رواج کو پیش کرتا ہے۔ سردار جمال خان کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو اپنی راجدھانی کا خدا ہے۔ اپنے علاقے کے لوگوں کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے والا اپنے بیٹے کو بھی اپنے نقشِ قدم پر چلاتا ہے۔ جس کی سوچ اور خیال اس کے پر عمل سے واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنی سوچ و خیال کو زبان و عمل کی صورت پیش کرتا ہے۔ قبائلی علاقوں میں حکومت کی باگ دوڑ کسی سرکاری عہدیدار کے پاس نہیں بلکہ جرگہ کے سردار کے پاس ہوتی ہے۔ جرگے کا سردار ہر چیز کا فیصلہ کرتا ہے۔ سردار جمال خان قبیلے کا سردار ہے۔ اسی سردار کی حیثیت سے وہ ہر برا کام سرانجام دیتا ہے۔ سردار جمال خان بی بی جانم سے شادی کرتا ہے۔ اس کو اس حویلی میں قید کر کے رکھتا ہے۔ قبائلی طرزِ بدوباش میں سب سے اہم مرد ہی ہے۔ عورت کسی لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل نہیں۔ وہاں کے مردوں کی سوچ اور خیالات ان کی تربیت کے عکاس ہیں۔ گھر، گھریلو رسم ورواج اور ماحول وہ واحد شے ہے جس سے بچہ سب سے پہلے روشناس ہوتا ہے۔ اسی سے انسان کی شخصیت بکھرتی اور نکھرتی چلی جاتی ہے۔ سردار جمال خان کے کردار میں قبائلی علاقوں کی چٹانوں جیسی سختی ہے۔ وہ ہر اچھائی سے ماورا ہے۔ اس کی شخصیت پر بین الاقوامی جامعہ کی اعلیٰ تعلیم بھی کوئی مثبت اثر نہیں ڈال سکی۔ اس نے اپنے آباءو اجداد کی ریت ورواج کو آگے بڑھاتے ہوئے جرگہ سسٹم کو مضبوط کیا۔ وہ دشمنی میں اس حد تک گر جاتا ہے کہ دشمن کی بہن کو نہ صرف اغوا کر کے باندی بناتا ہے بلکہ اس کم عمر لڑکی کو اپنے نکاح میں لے لیتا ہے۔ یہ لڑکی اس کی تیسری بیوی ہوتی ہے۔

"تم ہو کہ چپ" ڈرامے میں سزا دینے کا انوکھا رواج ہمارے سامنے آتا ہے، جو کہ کسی حکومتی قانون کی طرف سے نہیں بلکہ قبیلے کے سردار کی طرف سے سنائی جاتی ہے۔ سردار چوری کے ملزم کو مجرم ثابت

کرنے کے لیے دہکتے کوئلوں پر چلنے کا حکم سناتا اور کہتا ہے کہ اگر اس کے پاؤں جل گئے تو قصوروار ہو گا اور اگر نہ جلے تو بے قصور ہو گا۔ قبیلے کے مجمعے کے سامنے اس بات کا تماشا لگایا جاتا ہے اور تماشا دیکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد بڑے میدان میں موجود ہوتی ہے۔ اس بھیانک کھیل کے لیے پہلے لوگوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ پھر سردار غرور کے ساتھ نشست پر براجمان ہوتا ہے ایک شخص آکر مجمعے میں یہ اعلان کرتا ہے۔

"سنو! علاقے کے لوگوں سنو، سنو علاقے کے لوگوں سنو، اپنے رواج اور رسم و رواج کے مطابق بڑے سردار کی طرف سے چور کو اس علاقے کی رسم و رواج کے مطابق انگاروں پر چلایا جائے گا اس کی بے گناہی کا ثبوت اگر کسی کے پاس ہے تو سردار کے سامنے آکر گواہی دے۔"(۹)

سردار جمال خان کی ظلم کی ایک اور داستان بھی ہمیں ڈرامے میں دکھائی دیتی ہے۔ سردار جمال خان کی سلطنت میں غلطی کی معافی نہیں البتہ سزا ضرور ہے۔ تم ہو کہ چپ ڈرامے میں ہمیں سردار جمال خان کا کردار ایک اور خود ساختہ روایت کا منظر دکھاتا ہے۔ جس میں سزا کا انوکھا روپ ڈرامے کے کلائمکس میں اس وقت نظر آتا ہے، جب سردار اپنی محبوب بیوی کو غلطی کرنے پر زندہ درگور کرنے کا نہ صرف حکم سناتا ہے بلکہ اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ غلطی پر زندہ درگور کرنا بھی ظلم و بربریت کی روایت کا حصہ ہے۔ سردار جمال خان عزیز از جان بیوی بی بی جانم کو، بہو کو حویلی سے بھگانے میں مدد کرنے پر زندہ درگور کرنے کا حکم دیتا ہے اور اپنے بیٹے کو بھی اس خاندانی روایت کا لفظ زندہ رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ جب میر ضرار روتے ہوئے زندہ ماں کو قبر میں اتارنے سے انکاری ہوتا ہے تو سردار جمال خان اس کو یوں تنبیہ کرتا ہے۔

"(جلال میں بولتے ہوئے) ہمارا جد امجد میر شاکر بھی اس آزمائش سے گزرا تھا۔ اس نے اپنی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے ایک معصوم بچے کا گلا کاٹا تھا۔ وہ معصوم بچہ کوئی غیر نہیں تھا اس کا اپنا جگر گوشہ تھا آج ہم اور تم اس آزمائش میں ہے اور ہمیں اس آزمائش پر پورا اترنا ہے ڈالو اس پر مٹی۔"(۱۰)

عام قبائلی علاقوں کا اپنا اپنا دستور اور رواج ہوتا ہے جس کو نہ وہ چھوڑتے ہیں اور نہ ہی اس میں ردوبدل

کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان علاقے کی حالت آج بھی ویسی ہی ہے۔صدیوں بعد ادھر کوئی ایسا جوان پیدا ہوتا جو ان روایتوں کے خلاف ہوتا اور ان کو بدلنے کے لیے پورے سسٹم سے لڑ جاتا ہے، ایسا ہی کردار میر ضرار کے بیٹے کا تھا جس کے واپس آنے سے کہانی کے اختتام میں امید کا دیا ٹمٹماتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

قبائلی علاقوں میں باپ کے بعد بیٹا سرداری کی گدی پر بیٹھتا ہے۔جب بیٹا اس قابل ہو جاتا ہے تو اس روایت کے مطابق اس کو دستار پہنائی جاتی ہے۔ سردار جمال خان دستار پوشی کے موقع پر خوشی سے سرشار ہو کر اس سے یوں مخاطب ہوتا ہے: "ماشااللہ، ماشااللہ میر ضرار ولایت میں اس دستار کا اہمیت بھول تو نہیں گیا"(۱۱)

سردار شادی کرتا ہے تو پہلی بیوی رواج کے مطابق اپنے ہاتھوں سے دوسری دلہن تیار کرتی ہے وہ دل پر پتھر رکھ کر یہ عمل سرانجام دیتی ہے۔ یہ بھی یہاں کا عام رواج ہے۔جب سردار کی بیوی اس کی تیسری بیوی کو تیار کرتی ہے تو بی بی زیتون غمزدہ ہوتے ہوئے، بی بی جانم سے کہتی ہے:

"بی بی جانم، پری وش کو میں نے تیار کر دیا ہے یہ تو میرا حق تھا۔
بی بی زیتون: میں نے تو اپنا حق بہت پہلے ہی چھوڑ دیا تھا جب تمہیں شادی کی رات تیار کیا
تھا ایک دن یہ بھی اپنا حق چھوڑے گی۔"(۱۲)

"دل تو بھٹکے گا" میں بھی ہمیں جاگیر درانہ سوچ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔اس ڈرامے میں بھی مرد کی حاکمیت اور عورت کی محکومیت نظر آتی ہے۔ اس ڈرامے کا اہم کردار ٹھاکر ہے۔ ٹھاکر اپنے بیٹے کی عیاشی اور بے راہ روی کو تو نظر انداز کر دیتا ہے مگر بہو کا بے بسی میں کیا گیا جرم معاف نہیں کرتا۔ ٹھاکر کی بڑی بہو شوہر کے گزرنے کے بعد اس کی نارسائی کو رو رو کر یاد کرتی ہے، یاسمین کا شوہر اس پر ظلم کرتا ہے اور خود عیاشی میں زندگی گزار دیتا ہے۔ یاسمین اپنے جذبوں کی تسکین کے لیے ملازم کا ساتھ مانگتی ہے اور اس سے ناجائز تعلق بنا لیتی ہے۔ حویلی والے یاسمین کا راز فاش ہونے پر اسے سنگسار کرنے اور زندہ درگور کرنے کا حکم سناتے ہیں۔ ٹھاکر اس کے جرم کرنے پر جلال میں آجاتا ہے اور کہتا ہے:

"صدیوں میں ایسا نہیں ہوا ہے ہاں یہ ہوا ہے کہ نوجوان لڑکے نے کسی نوکرانی کے ماں
بننے کی خبر دی ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہوا ہے۔"
یہ داغ ایسے صاف نہیں ہوگا بہت سی جانیں جائیں گی تو صاف ہوگا۔"(۱۳)

اس ڈرامے میں غیر انسانی رویوں کے بارے میں بتایا گیا ہے اور ذات پات کی تقسیم کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ غریب و امیر ہونا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر انسان جذبات احساسات کا مالک ہوتا ہے۔ ممکن ہی نہیں ہے کہ غریب شخص جذبہ عشق و محبت سے عاری ہو کر زندگی گزارے۔ اگر غریب محبت کر ہی بیٹھے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حالات اور جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر سائیں بن جائے اور جنگلوں اور بیابانوں کا رخ کر لے اور محبوب کے وصال کا انتظار کرتا رہے۔ماضی کی بہت سی داستانیں ایسی ہیں جہاں مطلق العنان بادشاہ پورے طمطراق سے کہانیوں میں چھائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے بادشاہ المیہ کہانیوں کی جان ہوا کرتے ہیں۔ انہی کی بدولت کہانی جاندار ہوتی ہے۔ ظالم و جابر بادشاہ آزاد ہوتے ہیں، ان کے حکم کا اکا پوری ریاست میں چلتا ہے۔ وہ جس کو چاہیں تختہ دار پر لٹکا دیں اور جس کو چاہیں محل کی زینت بنالیں۔

ii۔ دہشت گردی کا موضوع

دہشت گردی دور حاضر کا ایک اہم موضوع ہے اس پر بہت سے قلم نگاروں نے تبصرے کیے ہیں۔ دہشت گردی کی کوئی جامع تعریف کرنا مشکل امر ہے۔ دہشت گردی کے کئی پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ دہشت گردی کے تناظر میں درپیش محرکات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے، تو معلوم ہو گا کہ دہشت گردی پھیلانے والے عام انسان ہی ہوتے ہیں مگر ان کا دماغ شیطانی خیالات کا مالک ہوتا ہے۔ جو سازشوں کا جال بنتا، ماحول میں تناؤ اور کھچاؤ پیدا کرتا ہے۔ ان افراد کا باطن ڈرپوک اور کمزور ہوتا ہے مگر ظاہری طور پر مضبوط اور طاقت ور ترین انسان نظر آتے ہیں۔ بقول پروفیسر کارک میکاولی:

> ”کسی سیاسی یا ذاتی مقصد کے حصول کے لیے تشدد کا استعمال یا استعمار کی دھمکی ایک بڑے گروپ کے خلاف چھوٹے گروپ کی جانب سے ہو تو دہشت گردی کہلاتی ہے اس میں چھوٹے گروپ کے لوگ بڑے گروپ کے لوگوں کو نشانہ بناتے ہیں۔“(۱۴)

دہشت گردی میں عام آبادی کو خوفزدہ کیا جاتا ہے۔ عام افراد میں خوف و ہراس پیدا کر کے اپنا مفاد حاصل کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے لوگوں کا خود پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اس طرح کسی ایک علاقے یا ملک سے امن و امان کا خاتمہ کرنے کی کوشش کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ دہشتگرد افراد اپنے قول سے زیادہ اپنے عمل کے

ذریعے اپنے ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ دہشت گردی کی تین صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

- جان بوجھ کر دانستہ عمل کیا جائے۔
- انسانیت سے ماورا عمل سرانجام دیا جائے۔
- قانون اور شرح سے دور ہوں۔

اس مسئلے سے دنیا کا ہر ملک نبرد آزما ہے۔ کوئی ملک کوئی جگہ ایسی نہیں جو اس کے شر سے محفوظ ہو۔ ایٹم بم اور جدید ہتھیاروں کی تخلیق جہاں انسان کی سائنس میں ترقی کی دلیل ہے، وہی نسلِ انسانی کے خاتمے اور تباہی کی دلیل ہے۔ پاکستان بھی ایک سپر پاور ملک ہے۔ یہاں بھی دہشت گردی کے مسائل میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ کوئی علاقہ اس شیطانی عمل سے محفوظ نہیں۔ لوگ اس ڈر اور خوف میں مبتلا ہے کہ کب اور کہاں ان کی جانوں کو نقصان ہو اور یہ کب زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

دہشت گردی میں قصوروار سے زیادہ بے قصور افراد سولی پر چڑھ جاتے ہیں۔ دہشت گرد اپنا ہدف حاصل کرتے ہوئے لوگوں کو نشانہ بناتے ہیں اور مخصوص علاقوں میں دہشت گردی سرانجام دیتے ہیں۔ ان کے ہدف میں صرف لوگوں کو جان سے مارنا نہیں ہوتا بلکہ وہ حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے ان کے دماغوں کو اپنے قابو میں بھی کر لیتے ہیں۔ وہ لوگوں کی زندگیوں میں انتشار، پریشانی، خوف، غصہ، گھبراہٹ پیدا کر کے نہ صرف لوگوں کو جسمانی طور پر بلکہ ذہنی طور پر بھی مفلوج کر دیتے ہیں۔ دہشت گردی دنیا میں بڑی تیزی سے پھیلی ہے۔ دہشت گردی سے ہمارا شعر و ادب بھی بہتمتاثر ہوا ہے۔ ادب میں ایسے عنوانات اور ایسے موضوعات شامل ہو گئے ہیں جن کا تعلق دہشت گردی سے ہے۔ ڈرامہ چونکہ فوری رد عمل پیش کرتا ہے اس لیے لوگوں کو دہشت گرد اور دہشت گردی کے بارے میں آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ میرے منتخب کردہ ڈراموں میں بھی دہشت گردی کا موضوع شامل ہے۔

ڈرامہ " خدا زمین سے گیا نہیں ہے " کی کہانی دہشت گردی کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس کی بدولت لوگوں کو دہشت گردوں کی کارکردگی سے آگاہی ملتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ملک دشمن عناصر کس طرح گلیوں اور بازاروں میں چھپ کر کسی ملک اور وہاں کے لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

پاکستان نائن الیون کے حادثے کے بعد دہشتگردوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اس سے ملک کی معاشی سماجی

ساکھ بری طرح متاثر ہوئی اور لوگوں میں ذہنی تناؤ بھی مسلسل بڑھتا چلا گیا۔ خود کش بم دھماکوں سے لوگ اپنے پیاروں سے بچھڑنے لگے اور قنوطیت کا شکار ہو گئے۔ ایسے میں ٹی وی ڈراموں فلموں کے لیے یہ ایک اہم موضوع ثابت ہوا۔ "خدا زمین سے گیا نہیں ہے" ڈرامے کا موضوع بھی دہشت گرد اور دہشت گردی کے اہم محرکات ہیں۔ اس کے ذریعے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ملک دشمن ہمارے ہی ملک کے افراد کو استعمال کرتے ہوئے ملک کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ڈرامے کی ہی بدولت ہمیں آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ کس طرح کچھ افراد کا گروہ ناپختہ ذہنوں کو اپنے قابو میں کر کے خود کش بم دھماکوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ دہشت گردی کا یہ جال اس قدر پھیل جاتا ہے کہ دہشتگرد گنجان آباد علاقوں میں بھی چھپ کر رہتے ہیں۔ ان کے مکالمے ان کی ذہنیت کو سامنے لاتے ہیں۔

"دہشت گرد: اس غیر ملکی کا قتل ہم پر واجب ہو گیا اس کو کوئی لینے نہیں آیا اس کا قیمت بھی کسی نے نہیں لگایا کمانڈر صاحب اس قتل کا ہم کو یہ فائدہ ہو گا کہ عائشہ کی جان کو خطرہ ہو گا اور پھر وہ لوگ ہمارے آدمیوں کو چھوڑ دے گا۔

خائستہ گل: اس فرنگی عورت کا کوئی نہیں پوچھے جتنا کوشش ہو رہا اس عائشہ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ دباؤ بڑھانے کے واسطے اس فرنگی عورت کا قتل اور اس کا ویڈیو جاری کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

دہشت گرد: اتحادی فوجوں پر دباؤ بڑھانے کے لیے یہ ضروری ہے کمانڈر صاحب اس کا قتل کر کے ویڈیو سارے چینلز پر ڈالے اس کو فائرنگ کر کے قتل کیا جائے گا۔"(۱۵)

اسی طرح یہ لوگ مذہب کے نام پر لوگوں کو غلط راہوں پر لے جاتے ہیں۔ اس کہانی میں پاک فوج کا کردار بھی بڑا جاندار ہے۔ ہیرو پاک فوج کی بدولت کہانی انجام تک پہنچتی ہے۔ ایک چھوٹے سے گھرانے سے اس کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈرامے کا ایک ذیلی کردار اللہ بخش ہے جو لوگوں کو خود کش دھماکے کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور دین اسلام کو معصوم ذہنوں کے سامنے بدل کر پیش کرتا ہے۔ یہ معصوم افراد کو خود کش دھماکوں کے لیے بھیجتا ہے۔ ان میں مرنے والوں کی تعداد کا تو کوئی حساب نہیں مگر جب کسی ایک انسان کو بلاوجہ مرنے کی ترغیب دی جائے تو اس کی شخصیت بکھر کر رہ جاتی ہے۔ وہ یا تو حالات سے سمجھوتہ کر لیتا ہے، یا

پھر اس کے الٹ حالات کے ساتھ چل پڑنے کی ٹھان لیتا ہے۔ دتّا کا کردار ایسا ہی ہے جو بچپن سے اللہ بخش کے ہاں زیر تعلیم رہ کر بھی جب ہوش و خرد کی منزل طے کرتا اور خود کش دھماکے کے لیے نکلتا ہے تو اس کی زندگی ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ وہ فرار ہو کر پولیس کے پاس جا پہنچتا ہے۔ اس ڈرامے میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بھرپور اعلان سنائی دیتا ہے۔ ڈرامے میں شروع سے لے کر آخر تک پاک فوج کے جوان لڑتے نظر آتے ہیں ۔ کہیں وہ شہادت کے رتبے پر فائز ہو جاتے ہیں اور کہیں غازی بن کر لوٹتے ہیں۔ دہشت گردوں کے علاقوں میں کئی آپریشن کیے جاتے ہیں جن میں پاک فوج کامیاب ہوتی ہے۔ اس ڈرامے کے ذریعے ہمیں باہمت اور نڈر سپاہی نظر آتے ہیں جو کسی بھی قیمت میں اپنے ملک کی حفاظت کے لیے تیار ہیں۔

"میجر: کل یہاں decide ہوا ہے کہ چار fighting petrol attack کریں گے
جن میں سے ایک کو میں lead کروں گا ہم Multi-dimensional
attack کریں گے تا کہ ان کو confuse کر سکیں گے۔ اس بار ہم فیصلہ کن جنگ لڑیں
گے اور اس area کو clear کریں۔"(۱۶)

"خدا زمیں سے گیا نہیں ہے" میں ڈرامے کے آخر میں مصنف کے یہ الفاظ ہمیں دہشت گردی سے نجات حاصل کرنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔

"دہشت گردی کی یہ آگ ابھی بجھی نہیں ہے اسے بجھاتے ہوئے شاید ہمارے ہاتھ جل
جائیں مگر ہمارے صحن میں لگی ہے بجھانی تو ہمیں ہی پڑے گی۔۔۔۔۔"(۱۷)

ملک دشمن عناصر لوگوں کو اسلام کے نام پر گمراہ کرتے اور ان کو خود کُش دھماکوں کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اس ڈرامے کے ذریعے ہمیں دہشتگردوں کی کارکردگی کا بھی علم ہوتا ہے، کہ کس طرح وہ لوگوں کو بے وقوف بناتے اور ان کو مرنے کے لیے تیار کرتے ہوئے پھولوں کے ہار پہناتے ہیں اور مبارک بادیں دی جاتی ہیں جس سے ان کے اندر جوش و جذبہ پیدا ہو جاتا ہے مگر ڈرامے کے اختتام تک ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگوں کو نشہ آور دوائی پلا کر اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔

دہشت گردی کئی اقسام ہیں۔ اس میں پورے ملک کو بھی نشانہ بنایا جاتا ہے، جبکہ ایک فرقے ایک طبقے کو بھی نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ میرے منتخب کردہ ڈراموں میں دوسرا ڈراما "تم ہو کہ چپ" (جس کا مفہوم کچھ

یوں ہے کہ: ظلم کو برداشت کرنے والا ظالم کے ظلم کو اور مضبوط کرتا ہے)۔ اس ڈرامے کا آغاز تو بڑے خوب صورت منظر سے ہوتا ہے۔ بظاہر یہ محبت کی ایک کہانی ہے مگر اس کہانی میں کئی اور ذیلی کہانیاں بھی شامل ہیں ۔ آغاز کے خوبصورت منظر کے پیچھے ایک بھیانک تصویر پوشیدہ ہے۔ وہ منظر پاکستان کی سرزمین کے قبائلی علاقے کا ہے۔ حویلی شان دار مگر پیچیدہ ہے۔ اس میں عورتوں کو دہشت اور رعب کے ذریعے سے غلام بنایا گیا ہے۔ قید کرنے والے اس حویلی کے سردار ہیں جو عورتوں کو جانور سے بھی کمتر سمجھتے ہیں۔ جو عورت ان کی حویلی میں ایک بار آجاتی ہے وہ مر کے ہی وہاں سے واپس نکلتی ہے۔ سردار جمال خان نے علاقے میں اپنی دہشت اتنی زیادہ پھیلائی ہوئی ہے کہ لوگ اس کے نام سے ہی کانپنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جرم کی تصدیق کیے بغیر ہی سزا دینے والا اپنی مرضی سے لوگوں کو تختہ دار پر لٹکاتا ہے۔ ایسا کردار جو دہشتگرد کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے، اپنی محبوب بیوی بی بی جانم کو جرم کرنے پر زندہ درگور کرنے کا حکم سناتا اور پھر اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں ہمیں دہشت و جبر کی ایک لازوال داستان ملتی ہے۔ اصغر ندیم سیّد اس کہانی کو بڑے ہلکے پھلکے انداز میں شروع کرتے ہیں۔ پھر درجہ بدرجہ مناظر کے بدلاؤ سے کہانی کو نئے روپ میں سامنے لے آتے ہیں۔ اس کی ابتدا جامعہ کے دو طلبا کے درمیان پیار سے ہوتی ہے اور سردار جمال خان کا دہشت زدہ کردار کی بدولت یہ کہانی المیہ کا روپ دھار لیتی ہے۔ دہشتگردی کا موضوع ہمیں ان دونوں ڈراموں میں نظر آتا ہے۔

جرم کو جس طرح دنیا کے دیگر خطوں میں حقارت سے دیکھا جاتا ہے اسی طرح پاکستان میں بھی اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے اپنے ہی ملک کے افراد مذہب کا سہارا لیتے ہوئے جرائم پیشہ عناصر کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ ان ڈراموں میں اغوا برائے تاوان، قتل کے بدلے قتل، نسل در نسل دشمنیاں، خودکش بم دھماکے، عورت کا استحصال، کالا انصاف، عورتوں کو باندی بنا کر قید میں رکھنا، ذہنی اور جسمانی تشدد، جیسی تصویریں جابجا بکھری نظر آتی ہیں۔ تم ہو کہ چپ ڈرامے میں ہمیں سائیزن بی بی اور دوسری عورتیں باندی بنی زنجیروں میں جکڑی قید میں نظر آتی ہیں۔ اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ گھریلو مسائل اور معاملات کو کس طرح ظلم و جبر سے نمٹایا جاتا ہے۔ وڈیرہ ازم پورے معاشرے اور ذاتی زندگی پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے محاورے پر عمل کرتے ہوئے لوگ جب اور جیسے چاہیں انسانیت کو بربادی کرتے چلے جائیں۔

iii۔ غربت و افلاس

غربت کی اصطلاح کا ذکر عام طور پر کسی انسان یا معاشرے کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے پس منظر میں کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی غربت کا لفظ مختلف اوقات اور مختلف معنوں میں آتا ہے یعنی یہ کسی معاشرے یا انسان کی مادی ضروریات کی کمی سے تعلق رکھتا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں اب تک غربت کی پانچ بڑی وجوہات ہیں۔

غربت کی سب سے بڑی وجہ آبادی میں اضافہ ہے۔ دنیا میں اس وقت تقریباً آٹھ کھرب لوگ رہتے ہیں۔ ہر فرد دوسرے فرد سے الگ ہے ہر بندہ فاقے نہیں کر سکتا یوں غربت جرائم کو جنم دیتی ہے۔ پاکستان ایک پسماندہ ملک ہے اور یہاں لوگوں میں تعلیم کی بے انتہا کمی ہے۔ اگر لوگوں کو کہا جائے بچے دو ہی اچھے تو ان کا ردِ عمل عجیب ہو جاتا ہے۔ دراصل ان لوگوں کے خیال میں یہ بات اڑ جاتی ہے کہ اللہ جس کو بھی پیدا کرتا ہے اس کے ساتھ رزق بھی پیدا کرتا ہے۔ یوں یہ لوگ عقیدت کے مارے دس، دس بچے پیدا کرتے ہیں اور اپنے ساتھ ساتھ آنے والے کی بھی زندگی خراب کرتے ہیں۔ زیادہ تر دیہاتی علاقوں یا پسماندہ علاقوں میں ایسا رواج پایا جاتا ہے۔ پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی پاکستانیوں کو غربت کی طرف لے جا رہی ہے۔ پاکستان کی آبادی اب بیس کروڑ تک جا پہنچی ہے۔

جنگ غربت کی وجوہات میں سے دوسرے نمبر پر ہے اور دنیا میں جنگ نے انسانوں کو غریب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جنگ جس بھی وجہ سے ہو اس میں انسانی جان جاتی ہے۔ ایک ملک، قبیلے یا علاقے کا سارا مال و دولت دوسرے علاقوں میں چلا جاتا ہے یوں وہ لوگ غربت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کو غلام بنایا جاتا ہے۔ جس سے ان کی اولاد اور وہ خود بنیادی ضروریات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بے شک انسان ابھی تک قدرتی آفات پر قابو نہیں پا سکا جس کی وجہ سے اسے بہت سا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ قدرتی آفات میں سونامی، قحط، زلزلے، سیلاب وغیرہ شامل ہیں۔ قدرتی آفات کی وجہ سے انسانوں کے گھر ٹوٹ جاتے ہیں، ان کا جانی و مالی نقصان ہوتا ہے۔ یوں قدرتی آفات نے انسانوں کی غربت میں اہم کردار ادا کیا۔ جب ایک معاشرے میں علم و ہنر کی کمی ہو تو وہ معاشرہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ جب کسی فرد کو یہ ہی نہ معلوم ہو کہ اس

نے اپنی زمین میں کیا اور کیسے بونا ہے تو وہ کیا کاٹے گا۔

معاشی لوازماتِ زندگی کے اعتبار سے غربت کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ؛ غربت کسی معاشرے کی ایسی حالت کا نام ہے جس میں اس کے پاس کم ترین معیار زندگی (minimum standard of living) لازم اسباب وسائل کا فقدان ہو۔ سادہ سے الفاظ میں کہا جائے تو یوں کہ سکتے ہیں کہ غربت، بھوک و افلاس کا نام ہے۔ جب کسی کو اتنی رقم میسر نہ ہو کہ وہ اپنا یا اپنے اہل و عیال کا پیٹ بھر سکے تو یہی غربت ہے۔ اگر کوئی بیمار ہو جائے اور اس کے پاس وسائل نہ ہوں کہ وہ دوا حاصل کر سکے تو یہ غربت ہے۔ جب کسی کے پاس سر چھپانے کی جائے پناہ نہ ہو تو یہ غربت ہے اور جب بارش میں کسی کے گھر کی چھت ایسے ٹپکتی ہو کہ جیسے وہ گھر میں نہیں کسی درخت کے نیچے بیٹھا ہو تو یہ غربت ہے۔

منتخب کردہ ڈراموں میں ہمیں غربت و افلاس جیسے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں ہمیں غریب طبقے کی عکاسی اور ان کے مسائل کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے یہاں غریب طبقہ بدحالی کا شکار ہے۔ "خدا زمیں سے گیا نہیں ہے" میں مدرسہ اسکول اور اس کی بدحالی کا منظر نظر آتا ہے۔ غریب طبقہ اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو مدرسے میں داخل کرواتے، اور ان کو تڑپنے کے لیے وہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ مدرسوں کا یہ عام رواج اور طریقہ خاصا سفاکانہ ہے۔ جس سے نہ صرف بچوں کی تربیت متاثر ہوتی ہے بلکہ ان کی شخصیت ایک منفی رویہ اختیار کر جاتی ہے۔ لوگوں کے لیے اولاد پیدا کرنا تو آسان مگر اسے پالنا اس کی ضرورت کو پوری کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ اس لیے لوگ اس مسئلے کے حل کے لیے اپنی اولاد کو غیروں کے ہاتھوں میں دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ان کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی شخصیت خطرناک شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔ "خدا زمین سے گیا نہیں ہے" میں بہت واضح انداز میں اس کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ اصغر ندیم سید دتّا اور اللہ بخش کے کردار کے ذریعے واضح کرتے ہیں کہ لوگ مجبوری میں کیسے غلط فیصلے کر جاتے ہیں۔ مولوی اللہ بخش کیسے لوگوں کو بیوقوف بناتا اور معصوم بچوں کو یرغمال بنا کر ان کے دماغ کے کورے کاغذ پر اپنی مرضی کی تحریر لکھتا اور ان کو مکمل طور پر دہشت گرد بنا دیتا ہے۔ غربت کے مارے یہ غریب افراد کیسے برباد ہوتے ہیں، ان کی بڑی واضح تصویر ان ڈراموں میں دکھائی گئی ہے۔

آج بھی قبائلی علاقوں میں مدرسہ اسکول کا رواج ہے۔ غریب لوگ اپنے بچوں کا خرچ اٹھانے کی غرض سے انہیں مدرسوں میں ڈال دیتے ہیں۔ بچے ادھر ہی اپنی ادھوری زندگی گزارتے ہیں۔ اصغر ندیم سید نے اس عام رواج کو بھی اپنے ڈرامے میں جگہ دی ہے۔ وہ مدرسہ سکولوں اور وہاں موجود بچوں کی زندگیوں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ وہ اس ڈرامے کے ذریعے مدرسوں میں پرورش پانے والے بچوں کے مسائل، ان پر کیا جانے والا بہیمانہ سلوک اور ان کی متاثر کن شخصیت کو سامنے لاتے ہیں۔ " خدا زمین سے گیا نہیں ہے " میں مولوی اللہ بخش کا کردار اور منظر ہمارے سامنے ایسا ہی موضوع پیش کرتا ہے۔ دتّا کے والدین اسے دو وقت کی روٹی نہیں دے سکے۔ جس کے باعث وہ اسے مدرسے میں بنا فیس داخل کرواجاتے ہیں۔ مولوی اللہ بخش اپنے مدرسے کا قانون واضح کرتا اور شرط رکھتا ہے کہ وہ اس سے مل نہیں سکیں گے جب تک وہ بڑا نہیں ہو جاتا۔

ڈراما "تم ہو کہ چپ" میں بھی ہمیں حاکم اور محکوم امیر و غریب طبقہ دکھائی دیتا ہے۔ حاکم محکوم طبقہ کی ذات عزت نفس سب کچل کر حکمرانی کرتا ہے۔ محکوم و غریب طبقہ صرف اور صرف اس وجہ سے مجبور ہے کہ وہ غریب ہے۔ ان کے پاس حاکموں کی چاکری کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ غریب مجبور بے سہارا حویلیوں میں ہر کام کرنے پر مجبور اور ان کی جوتیاں تک چاٹتے ہیں۔ ان کے زر خرید جانور، جن کو وہ مجبور کرتے ہیں کہ ان کی خدمت کے ساتھ ساتھ ہر غلط کام سرانجام دیں۔ اصغر ندیم سیّد حویلی کے پس منظر میں ہمیں غلام اور غریب طبقے کی جھلک دکھاتے ہیں کہ کیسے سالہا سال سے ان کے ملازم حویلی میں رہ رہے ہیں اور ان کی خدمت پر معمور ہیں۔ غلاموں کی سرشت میں صرف وفاداری ہے، وفاداری نہ کرنے کی سزا صرف اور صرف بھیانک موت ہے۔ موت بھی یا تو بھوکے کتوں کے آگے پھینک دینا یا کال کوٹھری میں بند کر دینا اور ادھر سسک سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دینا ہے۔ غریب طبقہ دو وقت کی روٹی اور کپڑے کے لیے بھی مجبور ہے۔ اس کے لیے جینا مشکل ترین عمل ہے۔ اسی باعث وہ حویلی کے حاکموں کا ہر حکم بجالاتے ہیں۔ امیر و غریب کا یہ انداز صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ ہر جگہ حاکم و محکوم اور امیر و غریب نظر آتے ہیں، یہ تو دنیا کا دستور ہے جہاں امیری ہے وہاں غریبی بھی انتہا کی ہے۔ اصغر ندیم سید نے بھی اپنے ڈراموں میں غریب عوام اور ان کے مسائل کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ "بول میری مچھلی" میں چار بیٹیوں کا باپ جو کہ ریٹائر پروفیسر تھا۔ سفید پوش ہونے کے باعث کسی کے آگے نہ تو ہاتھ پھیلا سکتا ہے، نہ صبر کے علاوہ کچھ کر سکتا ہے۔ اس کے لیے گھر چلانا

مشکل سے مشکل ترین ہو جاتا ہے۔ بیٹیوں کو پال پوس کر بڑا تو کر دیا مگر ان کو اچھی زندگی مہیا نہیں کر سکا۔ جس کا افسوس اس کو ہر وقت کچوکے لگاتا ہے۔ مصنف ڈرامے میں ایسے سفید پوش طبقہ اور ان کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ڈرامے کے کرداروں میں ہمیں غلام تو نہیں ملتے مگر غریب متوسط طبقہ ضرور ملتا ہے کہ گھر کا سربراہ کس طرح مالک مکان کے آگے ہاتھ جوڑتا ہے کہ ہمیں تھوڑا عرصہ اور رہنے دیں مگر وہ اسے مہلت نہیں دیتا اور اسے مکان سے نکال دیتا ہے۔ افرادِ خانہ اپنے زورِ بازو پر کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔ ڈرامے کے ابتدائی حصے میں ہمیں یہ خاندان ایک بے بس خاندان نظر آتا ہے، گھر کے سربراہ کی بیوی جو چند پیسوں کے عوض کپڑے سلائی کرتی ہے۔ ڈرامہ "دل تو بھٹکے گا" میں بھی ہمیں حویلی سسٹم نظر آتا ہے۔ حویلی میں ملازمین کی بھرمار ہے۔ ملازم غریب طبقہ چاکری کرنے پر مجبور ہے ملازم جان جو کہ حویلی کے بڑے بیٹے کا وفادار ملازم اور اس کے ہر غلط فعل کا گواہ بھی ہے اس کی زندگی حویلی تک محدود ہے۔ اس کا اپنا کچھ نہیں وہ ملازم غلام زادہ احساسات جذبات سے عاری، سیاہ فام ہونے کے باعث ملازمین میں بھی کم تر حیثیت رکھتا ہے حویلی والے اس کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اس کی پسند ناپسند کچھ نہیں۔ جب وہ اپنے جیسی ملازم خاتون کو پسند کر لیتا ہے تو حویلی کی بہو اس لڑکی کو حویلی سے نکال دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے ملازم جان دل برداشتہ ہو جاتا ہے تو حویلی کی بڑی بہو اپنے جذبوں کی تسکین کے لیے اس سے ناجائز تعلق بنا لیتی ہے۔ ملازم ملازم ہی رہتا ہے وہ بے قصور ہو کر بھی اپنے آپ کو سچا ثابت نہ کر سکا۔ جس کے باعث اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کردار کے ذریعے بھی اصغر ندیم سید غریب افراد کی مشکلات اور ان کے مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔ ان حویلیوں کے ملازم یا تو خدمت پر مامور رہتے یا پھر اپنے باپ کے قرض اتارنے کے لیے زندگی تیاگ دیتے ہیں۔ ملازمہ اپنی بے بسی کو ایسے پیش کرتی ہے:

"بابا نے میرے کو بوڑھے مٹل کے ہاتھوں بیچ دیا۔"(۱۸)

ملازم جان ملازمہ کی حمایت کرتا اور اس کو بچانے کے لئے اپنے مالک سے مدد مانگتا ہے۔

"سائیں اس کے باپ نے قرضہ لیا تھا اس کے عوض اس کو بیچ رہا تھا۔"(۱۹)

ڈراما نگار ڈراموں کے ذریعے غربت و افلاس کی بڑی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے ڈراموں

میں غریب آدمی کے مسائل کو واضح طور پر پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ نچلے درجے کا غریب طبقہ بھی احساسات اور جذبات رکھتا ہے۔ اس کی بھی خواہشات ہوتی ہیں مگر حاکم ان کے ساتھ بد سے بدتر سلوک کر کے انسانیت کے درجے سے گر جاتے ہیں۔

iv۔ خواتین کے مسائل

قیام پاکستان کے بعد اردو ڈرامے میں کئی اہم مراحل آئے۔ مختلف نظام کے شکنجے میں پستے ہوئے افراد جہالت اور خود غرضی کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور میں لوگوں میں صدائے احتجاج بلند کرنے کی طاقت نہ تھی اور لوگ اپنی اپنی ڈگر پر چلنے پر مجبور ہو گئے۔ بیسوی صدی کے آخر اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جو ڈراما لکھا گیا، اس میں سماجی اور داخلی مسائل پر زیادہ توجہ دی گئی۔ دور جدید میں مرد ڈراما نگاروں نے عورت کے مسائل کو بیان کیا۔ اصغر ندیم سید نے عورت کے مسائل سے پردہ اٹھایا۔ ان کے ہاں عورت کی مظلومیت اور شکستگی کے تمام موضوعات ملتے ہیں۔ جو آج کی لاچار اور مجبور عورت کو درپیش ہیں۔ عورت کی ابتر سماجی حالت اس کی معاشی بدحالی اور سم ورواج کے نام پر ان کے جذبات کی قربانی، ان کی ثانوی حیثیت اور جنسی مسائل کے تمام موضوعات کو اصغر ندیم نے بہت خوبی سے اپنے ڈراموں میں نبھایا ہے۔

ان کے ہاں دیہاتی غریب نچلے طبقے کی عورت، حویلیوں میں کام کرنے والی، ملازمت پیشہ قریباً ہر طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین کے مسائل ملتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں عورت حالات سے سمجھوتہ کر کے صرف زندگی نہیں گزارتی، بلکہ وہ خود کو حالات کے جبر کے تحت اس قدر مضبوط بنا لیتی ہے کہ اس کا کردار قاری کے ذہن میں نقش ہو جاتا ہے۔ ان کے چاروں ڈرامے عورت کے مسائل کو کسی نہ کسی صورت پیش کرتے ہیں۔ ان کے ڈرامے "خدا زمین سے گیا نہیں ہے" میں ایک ایسی عورت کی داستان بیان کی گئی ہے جو اپنے حقوق سے واقف نہیں ہے اور اگر وہ واقف ہو بھی جاتی ہے، تو شاید سماجی جکڑ بندیوں باپ اور بھائی کی عزت و غیرت کی وجہ سے زبان کھولنا گناہ سمجھتی ہے۔ پریشے کو اس کا باپ چار دیواری میں قید کر لیتا ہے اور پھر اس کا رشتہ اپنے دوست سے طے کر دیتا ہے۔ باپ خائستہ گل اپنی بیٹی کی عمر کی بیوی لے کر آتا ہے جس کو وہ کہیں سے خرید کر لاتا ہے۔ اس ڈرامے میں قبائلی علاقے کی عورت کے مسائل کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا

گیا۔ وہاں کا مرد عورت کے وجود کو ماننے سے ہی انکاری ہے۔ وہاں کے کالج سکول میں لڑکی تعلیم حاصل نہیں کر سکتی۔ اگر وہ آگے بڑھتی ہے، تو اس کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے ڈرامے کا ضمنی کردار بانو جس کالج میں پڑھاتی ہے وہاں کی پرنسپل کو کالج بند کروانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ اس دھمکی کے جواب میں وہ یوں بڑے ہی ناصحانہ انداز میں جواب دیتی ہے۔

"میڈم: دیکھیں کون ہے آپ کس طرح کا اسلام چاہتے ہیں آپ کہاں لکھا ہے کہ عورت تعلیم حاصل نہیں کر سکتی آپ کی والدہ نے تعلیم نہیں پائی۔ اس لیے آپ ایسے بن گئے ہیں میرے پاس آؤ میں تمہیں پڑھاؤں گی اسلام کہتا ہے تعلیم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے، اڑادو گے تو اڑادو اللہ کی نافرمانی کرو گے۔"(۲۰)

ہمارے معاشرے میں عورت کے سر پر شوہر کا سایہ نہ ہو تو اس کا معاشرے میں تنہا رہنا مشکل ہو جاتا ہے چاہے وہ کتنی ہی پڑھی لکھی مضبوط نڈر اور بہادر کیوں نہ ہو۔ ایسا ہی مسئلہ اس ڈرامے میں زرمینے عائشہ خان کے ساتھ بھی نظر آتا ہے۔ بیوہ ہونے پر اپنے بچوں کی کفالت کرتی ہے۔ مگر معاشرے کے کند ذہن افراد اس کے نوکری کرنے پر پابندی عائد کرتے ہیں اور اسے ڈراتے دھمکاتے بھی ہیں اور ایک دن اس کو اغوا کر کے اس کا قتل کر دیتے ہیں۔ یوں معصوم بچوں کے سر سے ماں کا سایہ بھی اٹھ جاتا ہے۔ مگر بانو آخری سانس تک لڑتی ہے۔ جب بانو اپنے گھر سے باہر کھانے کا سامان لینے نکلتی ہے تو نام نہاد مجاہد اس کو ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ اسی باعث اس کے اندر خوف سرایت کرتا چلا جاتا ہے بانو کمانڈر کو روتے ہوئے یوں جواب دیتی ہے: "بانو: بھائی میں بیوہ ہو میرے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ مجھے بچوں کو ناشتہ دینا ہے کیا کروں میں۔"(۲۱)

"تم ہو کہ چپ" میں جاگیر دار طبقہ بے جوڑ شادیوں پر فخر کرتا اور معصوم لڑکیوں کی معصومیت کو نوچ لیتا ہے۔ سردار جمال خان دشمن کی بیٹی کو یہ کہہ کر نکاح میں لے لیتا ہے کہ وہ اس کو پسند آگئی ہے اور اس سے بدلہ نہیں لیا جا سکتا ہے۔ سردار جمال خان کہتا ہے: "اب کیا کرے ہمارا اس پہ دل آگیا ہے۔"(۲۲)

اس کہانی میں مشل کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو ہوش سنبھالتے ہی ایک خوبصورت جانباز شہزادے کی ہمسفری کے خواب دیکھتی ہے۔ جامعہ میں اس کی ملاقات میر ضرار سے ہو جاتی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس کردار کے ذریعے بتایا جاتا ہے کہ عورت کو جب اس کی

مرضی کے مطابق خوابوں کی تعبیر نہ ملے تو وہ کس طرح شیرنی بن کر ہر خطرے کا سامنا کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ مشل کو جب شادی کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت خوبصورتی سے قبائل ازم کے جال میں قید ہو گئی ہے اور کوئی راہ فرار ممکن نہیں تو وہ اپنے آپ کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مشل کے کردار کے ذریعے مرد کی حاکمیت اور عورت کی محکومی کی بھیانک تصویر پیش کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں ایک مسئلہ وراثت کے حصے کا بھی ہے۔ لوگ جائیداد میں بہن کو حصہ دینا، اپنا نقصان سمجھتے ہیں اسی باعث قبائلی علاقہ جات میں بہنوں اور بیٹیوں کی شادی کرنے کا رواج بہت کم ہے اگر کی بھی جاتی ہے تو فائدہ اور منافع دیکھ کر کی جاتی ہے۔ اس ڈرامے میں سردار جمال خان کی بہن اور میر ضرار جو اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد کی پھوپھو ہے۔ اسے پاگل قرار دے کر تہہ خانے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اسے زنجیروں میں جکڑ کر باندھ دیا جاتا ہے۔ سائزن بی بی جوانی میں کسی کو پسند کر بیٹھتی ہے۔ سردار اپنی بہن کی شادی کرنے سے انکاری ہو جاتا ہے۔ بہن کو قید کرتا ہے اور اسی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتی کرتی وہ اپنی آخری عمر میں حقیقتاً پاگل ہو جاتی ہے۔ اس ڈرامے میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح مظلوم اور بے کس مجبور عورت بد دعاؤں کے ذریعے اپنے دل کا حال دوسروں تک پہنچاتی ہے۔

عورت ہر زمانے میں مظلوم، بے کس و مجبور رہی ہے۔ عورت کا مرد اگر دوسری شادی کر لے تو اسے بولنے اور آواز اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ گھٹ گھٹ کر مرتی ہے اور چھپ چھپ کر تماشا دیکھتی ہے۔ میر ضرار کی پہلی بیوی جو خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے کا کردار بہت بے بس مجبور کردار ہے مگر اس کردار میں حسد رقابت کے جذبات مشل کو دیکھ کر سر اٹھاتے ہیں اور اسی حسد و رقابت میں وہ مشل کے کھانے میں زہر ملا دیتی ہے۔

عورت ہو یا مرد مسائل کا اثر دونوں پر پڑتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ عتاب کا نشانہ عورت کو ہی بننا پڑتا ہے۔ اصغر ندیم سید نے اپنے ڈراموں میں خواتین کے مسائل میں حقیقت نگاری کو مد نظر رکھا اور زندگی کے مسائل کو حقیقت کا رنگ دے کر پیش کیا۔ غربت معاشرے میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم سے پیدا ہوتی ہے۔ معاشرے میں امیر عزت دار طبقہ اپنے ہر برے فعل کو روپے پیسے سے چھپا لیتے ہیں جبکہ غربا عزت بچاتے بچاتے زندگی تیاگ دیتے ہیں۔ ہمارے طبقاتی معاشرے میں آج بھی عورت کو عزت و مقام حاصل نہیں جس کی وہ خواہاں ہے۔ "بول میری مچھلی" ڈراما ہمارے معاشرے کی حقیقتوں کو سامنے لاتا ہے۔ انہی

حقیقتوں کو سامنے لانے کے لیے اصغر ندیم نے نو عمر لڑکیوں کے گرد کہانی کی بنیاد رکھی ہے۔جو اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگتی ہوئی عزت و آبرو کو دان کر آتی ہے۔اس ڈرامے میں لڑکیوں کا لاابالی پن سامنے آتا ہے۔کس طرح اپنے خواب اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہوئے عزت کا سودا کر کے موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں۔

اس ڈرامے میں عورت کے مسائل کی واضح نشاندہی کی گئی ہے کہ کس طرح گھر سے باہر نکل کر کام کرنے والی عورتیں مردوں کے فریب کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔رباب، سحاب، نورین تینوں خواتین مردوں کے جال میں پھنس کر اپنی عزت و آبرو سب کچھ داؤ پر دیتی ہیں۔رباب جو کہ مجاز صدیقی کے عشق میں گرفتار ہے، ناجائز تعلقات کی بنا پر موت کے منہ میں چلی جاتی ہے۔اس ڈرامے کے ذریعے نہ صرف عام لڑکی کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے بلکہ ماڈل کے مسائل کو بھی پیش کیا گیا ہے کہ کیسے نورین نامی لڑکی پیسوں کے عوض اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔وہ کس طرح سے ترقی کی منازل طے کرتی ہوئی لوگوں کے ہاتھوں نیلام ہوتی چلی جاتی ہے۔وہ یہ نہیں سوچتی ہے کہ اس کی زندگی کس طرح گندگی کی طرف اس کو لے کر چل پڑی ہے۔

"دل تو بھٹکے گا" میں عورت کے جذبات واحساسات کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے۔یاسمین کا شوہر مر جاتا ہے اور خاندان والے اس کی شادی دیور سے کرنا چاہتے ہیں۔کلائمکس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب یاسمین ملازم کے بچے کو جنم دیتی ہے۔ریشم کے کردار کے ذریعے عورت کے بے لگام جذبوں کو معاشرے کے سامنے لایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ مرد کی طرح عورت بھی غلط راستے کا انتخاب کر سکتی ہے اور عورت بھی جذبات واحساسات کی مالک ہے۔

اصغر ندیم سید کا ہر دوسرا ڈراما عورت کے مسائل پر مبنی ہوتا ہے۔ان کے افسانوں میں عورت کہیں نہ کہیں مسائل سے دوچار دکھائی دیتی ہے۔معاشرے میں کہیں غربت ہے تو کہیں طبقاتی تقسیم تو کہیں عورت کے بے لگام جذبے۔غرض یہ کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی عورت کے لیے مکمل تحفظ کہیں نہیں ملتا۔"دل تو بھٹکے گا" میں اصغر ندیم سید سب کی توجہ جیتی جاگتی انسانی جذبات سے لبریز عورت کی طرف دلاتے ہیں۔اس کی ضرورت ویسی ہی ہوتی ہے جیسی عام انسانوں کی۔اپنی مادی ضروریات کو تو وہ کسی نہ کسی طرح پورا کر لیتی ہے مگر جذبوں کی تسکین کے لیے اسے مرد کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔عورت کی جب یہ ضرورت

پوری نہ ہو تو وہ غلط راہ کی طرف چل پڑتی ہے۔ ایسا ہی اس ڈرامے میں بھی ہوا۔ یاسمین اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے ملازم جانو کا سہارا لیتی ہے۔ اس کا شوہر جب زندہ ہوتا ہے، تب بھی اس کا نہیں ہوتا اور جب مر جاتا ہے تو وہ بے بس ہو جاتی ہے۔ ایسے میں ہمارے خاندانی نظام جوش مارنے لگ جاتا ہے۔ یاسمین کو سنگسار کرنے اور زندہ قبر میں اتارنے کی تجویز پیش کی جاتی ہے، لیکن خوش قسمتی سے وہ بچ جاتی ہے۔

ہمارے گھرانوں میں عورت کی بے راہ روی کو گالی سمجھ لیا جاتا ہے جبکہ مرد کی بے راہ روی کسی زمرے میں نہیں آتی ہے۔ عورت کو غلط کام کرنے کے بعد جینے کا کوئی حق نہیں دیا جاتا یہی حال یاسمین کا بھی ہوا ہے:

> یاسمین: ''بس ایک لمحے نے مجھے کمزور کر دیا مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی روک نہ سکی اب اس حویلی کی عزت صرف تمہارے ہاتھ میں ہے۔''(۲۳)

ہمارے یہاں کا معاشرہ عورت کو سزا سنانے میں حق بجانب ہے لیکن وہی کام اگر مرد کرے تو اس بات کو خاطر میں نہیں لایا جاتا ہے۔ کچھ گھروں میں عورت کو فالتو چیز سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے اور وہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے غیر اور نامحرم مردوں کا سہارا لیتی ہے۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ اور حساس موضوع ہے۔

اس ڈرامے میں صوفیہ کا کردار ایک ذیلی کردار ہے۔ اس کے باعث کہانی حویلی کی چار دیواری سے نکل کر شہر کی آزاد فضاؤں میں سانس لیتی ہے۔ یہاں خواہشوں کے پیچھے بھاگنے والی لڑکی کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ آج کل کی لڑکیاں اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے اپنی جان اور عزت تک قربان کر دیتی ہے۔ صوفیہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ امیرانہ زندگی جینے کے لیے اور اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے لیے اپنے آپ کو پیسوں کے عوض بیچ دیا اور جب اس بات کی خبر اسے چاہنے والے شائل کو ہوتی ہے، تو وہ اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ یہاں عورت کی نازک، کچی ڈور جیسی عزت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اگر یہ ایک بار ٹوٹ جائے تو دوبارہ جُڑ نہیں سکتی ہے۔

"بول میری مچھلی" میں نورین کے یہ الفاظ ہمیں بتاتے ہیں کہ باہر نکل کر پیسہ کمانے کی دوڑ میں بھاگنے والی لڑکیاں کس طرح سے مسائل کا شکار ہوتی ہیں۔

ماہین سے بات کرتے ہوئے پریشانی میں مبتلا ہو کر نورین کہتی ہے کہ:

"رباب آپی ہمارے لیے جانے کن کن لوگوں کی باتیں برداشت کرتی ہیں۔ آج یونیورسٹی میں ایک سیمینار تھا پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ جاب کرنے والی عورتیں کس طرح sexually مردوں سے ہی harassed ہوتی ہیں۔ کوئی بھی مرد کسی عورت کو بغیر طلب کے کام نہیں دیتا۔ عورت کو یہ society accommodate ہی نہیں کرتی۔"(۲۴)

ہمارے معاشرے میں غربت کے باعث بہت سی لاچار اور بے بس عورتیں اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ مگر جب ضرورت حد سے سوا ہو جائے تو پیسوں کا انتظام عزتیں نیلام کر کے بھی کرتی ہیں۔ یہاں عورت کے ایک اور مسئلے کی طرف بھی توجہ دلائی جا رہی ہے۔ مرد کو اگر پیسوں کی ضرورت ہو تو وہ جائز اور ناجائز طریقے سے کما لیتا ہے۔ مگر جب عورت درندوں کے معاشرے میں نکلتی ہے تو اس کے پاس واحد ذریعہ جسم فروشی ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے جسم کو نیلام کر کے پیسے کماتی ہے۔ اس کے بعد عورت کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا، وہ خالی ہو جاتی ہے۔ "بول میری مچھلی" میں نورین کا کردار بھی ایسا ہی ایک کردار ہے۔ اپنے باپ کو شرمندگی سے بچانے کے لیے اور گھر کا بندوبست کرنے کے لیے ماڈلنگ کی راہ چنتی ہے۔ جب اس کے باپ کو ہارٹ اٹیک ہوتا ہے، تو وہ پیسوں کے لیے اپنے جسم کی قیمت لگا لیتی ہے۔ جس سے اس کی زندگی مزید مشکل ہوتی چلی جاتی ہے متوسط طبقے میں جب کوئی لڑکی ایسی راہ چنتی ہے، تو اس کے لیے لوگوں کی باتیں برداشت کرنا اور سہنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میرے منتخب کردہ ڈراموں میں لکھاری نے خواتین کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ کہیں وہ قبائلی علاقے کی عورت کا حال بتاتے اور اس کے مسائل کو پیش کرتے ہیں تو کہیں وہ شہر کی پروردہ اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت کے مسائل سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے ہر طرح کی عورت کو اپنے ڈراموں کی شان بنایا ہے۔ وہ نہ صرف عورت کے مسائل کو پیش کرتے ہیں بلکہ ان مسائل کا حل بھی بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کمزور نہیں بلکہ اگر وہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرلے تو وہ ہر طوفان سے بھی ٹکرا سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از صبا وحید، لاہور، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت: شام ۵ بجے

۲۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از صبا وحید، لاہور، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت ۵ بجے

۳۔ مہناز انور، ڈاکٹر، اردو ووافسانے کا تنقیدی مطالعہ، نصرت نامی، پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء، ص: ۳۲

۴۔ مبارک علی ڈاکٹر، جاگیر داری، تاریخ پبلی کیشنز، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص: ۹

۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، اکبر کا ہندوستان، تاریخ پبلی کیشنز، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص: ۶۷

۶۔ نعمان صدیقی، ڈاکٹر، مغلوں کا نظامِ مالگذازی، ترقیِ اردو بورڈ، ہندِ، ۱۹۷۷ء، ص: ۱۰۴۔۱۰۵

۷۔ عمارہ طارق، ڈاکٹر، اردو افسانے میں جاگیر درانہ اور سرمایہ درانہ نظام کے مظاہر، مشمولہ، ماہنامہ فانوس، خاص شمارہ، لاہور، جنوری ۲۰۱۶ء، ص: ۲۳

۸۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، اسکرپٹ، تم ہو کہ چپ، مورخہ ۱۲ جون ۲۰۱۸ء، قسط: ۲۰، منظر ۷، ایکٹ: ۴

۹۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، تم ہو کہ چپ، مورخہ ۱۲ اگست، ۲۰۱۸ء، قسط: ۲، منظر ۹، ایکٹ: ۱

۱۰۔ ایضاً، قسط: ۱۸، منظر ۹، ایکٹ: ۴

۱۱۔ ایضاً قسط: ۱، منظر ۶، ایکٹ: ۱

۱۲۔ ایضاً، قسط: ۳، منظر ۵، ایکٹ: ۲

۱۳۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، دل تو بھٹکے گا مورخہ، ۱۰، جولائی، ۲۰۱۸ء، قسط: ۱۱، منظر ۲، ایکٹ: ۵

۱۴۔ دہشت گردی کی تعریف ،مورخہ ،۲۵، مئی،۲۰۱۸ء، بوقت ۴ بجےwikipedia.pk

۱۵۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، خدا زمیں سے گیا نہیں ہے مورخہ ،۱۳ ستمبر،۲۰۱۸ء، قسط:۱۴، منظر:۳، ایکٹ:۴

۱۶۔ ایضاً، قسط ۱۴، منظر ،۵، ایکٹ:۵

۱۷۔ ایضاً، قسط ۱۵، منظر، آخری، ایکٹ:۵

۱۸۔ اصغر ندیم، سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، دل، تو بھٹکے گا مورخہ ،۱۰، جولائی،۲۰۱۸ء، قسط:۶، منظر:۲، ایکٹ:۳

۱۹۔ ایضاً، قسط:۸، منظر ،۵، ایکٹ:۳

۲۰۔۔اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، خدا زمیں سے گیا نہیں ہے، مورخہ ،۱۴ ستمبر،۲۰۱۸ء، قسط: ۴، منظر:۸، ایکٹ:۳

۲۱۔ایضاً، قسط:۴، منظر ،۵، ایکٹ:۳

۲۲۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، تم ہو کہ چپ، مورخہ ۱۲ جون،۲۰۱۸ء، قسط:۶، منظر ۲، ایکٹ:۲

۲۳۔ اصغر ندیم، سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، دل، تو بھٹکے گا، مورخہ ،۱۰، جولائی،۲۰۱۸ء، قسط:۷، منظر:۹، ایکٹ:۴

۲۴۔ اصغر ندیم، سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، بول، میری، مچھلی، مورخہ ،۱۰، نومبر ،۲۰۱۸ء، قسط:۵، منظر:۲، ایکٹ:۳

باب سوم:

اصغر ندیم سید کے کرداروں کا نفسیات کے تناظر میں مطالعہ

الف۔ کرداروں کی نفسیات

نفسیات psychology دو یونانی لفظ psyche اور logos سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب روح اور سائنس یا کسی مضمون کا مطالعہ ہے۔ اس طرح نفسیات کو روح یا ذہن کا مطالعہ کہا جاتا ہے۔ ماہرِ نفسیات انسانی ذہن کا مطالعہ، ان کی حرکات و سکنات دماغی کارکردگی، یاد یکھنے سیکھنے محسوس کرنے وغیرہ میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ماہرِ نفسیات لوگوں کے تجربات کے علاوہ کسی بھی فرد کی پوری زندگی کا گہرا مطالعہ بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک سماجی سائنس ہے۔ اس کے دو اہم حصے ہیں شعور اور لا شعور، جن کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اپنے مقصد کو حاصل کرتے ہیں۔

لا شعور نے ادب میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ جوں جوں فنکاروں نے جدید نفسیات کو پرکھا اور جانا انہوں نے ادب کو نئے آہنگ سے روشناس کروایا۔ نفسیات ہی کی بدولت فنکاروں کی تخلیقات ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ادب ماحول کی پیداوار ہے۔ شعور اور لا شعور کے ہنگاموں سے ادب میں رنگینی آتی ہے۔ نفسیات دانوں کا خیال ہے کہ تخلیقی قوتیں انسان میں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ اسی عادت کے باعث شعور اور لا شعور کا سفر طے کرتا ہوا تخلیقی مراحل سے گزرتا ہے۔

> "ڈاکٹر فرائیڈ کا خیال ہے کہ؛ تمام ذہنی اعمال لا شعوری حصے سے شروع ہوتے ہیں۔ ہر شعوری کام کے پسِ پردہ لا شعور کی روح کام کرتی رہتی ہے۔ ذہن کی وسیع کائنات میں شعور سے زیادہ یہ لا شعور کام کر رہا ہوتا ہے۔"(۱)

نفسیات کے مطالعے کی مدد سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن ایک تہ خانے، کنوئیں کی طرح ہے۔ جس میں طرح طرح کا سامان محفوظ رہتا ہے۔ اس کا ایک حصہ شعور ہے جس کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ اس میں کیا کیا موجود ہے۔ دوسرے حصے یعنی لا شعور میں گھپ اندھیرا ہے اس کے بارے میں خود ہمیں کچھ خبر نہیں۔ یہاں وہ

ساری چیزیں جمع رہتی ہیں جنہیں ہر طرف ناپسند کیا جاتا ہے مثلاً جنسی خواہشات، لالچ، خود غرضی وغیرہ۔ مطلب یہ کہ انسان کی جو خواہشات پوری نہیں ہوتیں اور جو اتنی بری ہوتی ہیں کہ وہ ان کا ذکر بھی نہیں کر سکتا وہ اس اندھیری کوٹھری میں جا چھپتی ہیں۔ ہماری زندگی میں شعور سے زیادہ لاشعور کی کارفرمائی ہے۔ اور اس کی دنیا شعور کی دنیا سے کہیں بڑی اور طاقتور ہے۔ ہماری وہ خواہشات جو پوری نہیں ہو پاتیں اور جن کے ذکر تک کو سماج ناپسند کرتا ہے وہ دنیا کے خوف سے لاشعور میں جا چھپتی ہیں اور انہیں جب بھی موقع ملتا ہے وہ شعور میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہیں لیکن شعور اس موقع پر بند کا کام کرتا ہے اور انہیں پھر لاشعور میں دھکیل دیتا ہے۔

شعور انسان کا حال ہوتا ہے جس سے وہ کام سرانجام دیتا ہے مگر لاشعور میں انسان کی لاحاصل خواہشات ہوتی ہیں، جو دماغ کے بند کمرے میں موجود رہتی ہیں مگر ضائع نہیں ہوتیں اور وقت پڑنے پر ذہن کی سلیٹ پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ اس میں انسان کی ماضی قریب اور بعید کی تمام خواہشات ، جنسی خواہشات اور لاحاصل تمنائیں موجود رہتی ہیں۔ جو اس کے شعور سے بغاوت بھی کرتی ہیں۔ شعور اور لاشعور کے درمیان تحت الشعور بھی ہے۔ یہاں وہ چیزیں ہوتی ہیں جو انسان کو مکمل طور پر بھولی بھی نہیں ہوتیں اور اچھی طرح یاد بھی نہیں ہوتیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو دماغ پر زور دینے سے شعور کی سطح پر ابھر آتی ہیں۔ ذہن کو ان تین طبقوں میں تقسیم کرنے والا فرائیڈ ہے۔ وہ تحلیل نفسی کا موجد ہے تحلیل نفسی کا مطلب ہے ذہن کی تہہ میں چھپی ہوئی باتوں کا پتا لگانا۔

> "انسان کے کردار میں این ای ڈی انا اور فوق الانا آتی ہے. یہ تینوں قوتیں لگاتار ایک دوسرے سے ٹکراتی اور کردار پر دباؤ ڈال کر اس کے ظہور پذیر ہونے کا سبب بنتی ہیں۔ ان اقدار کو قابو میں رکھتی ہیں لیکن یہ انسانی کردار کے اخلاقی پہلو سے کوئی مطلب نہیں رکھتیں اس لیے شخصیت پر ایک تیسری قوت سر ابھارتی ہے، یہ فوق الانا ہے۔ یہ والدین سماج اور مذہب سے ملنے والے اخلاقی ضابطوں کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ یہ تمام ذرائع بچے کی تربیت کے دوران اسے بتاتے ہیں کہ اخلاقی رو سے کیا صحیح ہے یا غلط شخصیت کا یہ حصہ دراصل انا کا ہی ایک حصہ ہے، جو اس سے علیحدہ ہو کر مثالی انا کے طور

پر ابھرتا ہے۔"(۲)

نفسیات ادب کی تشریح و توضیح کے ساتھ ساتھ زندگی میں بھی مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ نفسیات کے ذریعے انسانی شخصیت کے تجزیہ اور حقائق کے پس منظر کو خاص نفسیاتی مسائل کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تخلیق کاروں نے بھی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا اور کرداروں کے تجزیہ اور لاشعور کی کارکردگی اور نفسیاتی توجیہات سے آگاہی حاصل کی۔ ادب کے نفسیاتی مطالعے کے لیے فنکار کے تخلیقی عمل کو سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن اس سے بھی پہلے اگر ہم جدید ذہن کی ساخت اور اس کی کیفیتات کو جان لیں تو نہ صرف اس کے تخلیقی عمل کی بنیادوں تک پہنچ سکتے ہیں بلکہ اس کے تخلیقی عمل کے مختلف مدارج سے بھی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سے ہم فنکار کی ذہنی صلاحیت اور اس کو دوسروں سے ممتاز کرنے والی خصوصیات کا بھی پتا لگا سکتے ہیں۔ نفسیات دان لکھتے ہیں:

> "کسی بھی ادبی تخلیق کی یہ اساسی صفت ہونی چاہیے کہ وہ بحیثیت ایک فرد ذاتی زندگی سے بلند ہو کر اور شاعر کے قلب و روح کی گہرائیوں سے ابھر کر تمام انسانیت کے قلب و روح کی صدا بن جائے۔ تخلیق میں ذاتی عناصر کا اظہار اسے محدود ہی نہیں کرتا بلکہ یہ ایک طرح کا گناہ بھی ہے۔"(۳)

ضروری ہے کہ ادیب اپنی ذات سے ہٹ کر لکھے اور اپنی تخلیق کو موثر بنائے۔ اردو زبان میں نثری ادب کا آغاز داستان سے ہوتا ہے۔ جن میں غیر فطری تخیلی کرداروں کی بھرمار ہے۔ داستان میں ہندوستانی معاشرت کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے لوگوں کی عادات و اطوار کی عکاسی ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ ادب فرضی داستانوں سے نکل کر حقیقی زندگی کی طرف گامزن ہوا اور مختلف اصناف ادب منظرِ عام پر آئیں۔ یوں ادب کے منظر نامے پر ناول، افسانہ اور ڈراما تشکیل پاتا نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں ادب بشمول ڈراما، ناول ،افسانہ دیارِ غیر کا سفر کرتے ہوئے ہندوستان پہنچے ہیں۔ اسی طرح مغرب کے زیر اثر ہندوستانی ادب میں بھی نفسیاتی تنقید اور نفسیاتی رجحان ملتا ہے۔ ادب میں پلاٹ سے زیادہ کرداروں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ کردار نگاری میں بھی فرد اور سماج کے تصادم سے زیادہ فرد کی داخلی کشمکش کو نمایاں کرنے کا رجحان غالب ہے۔ فنکار اس سلسلے میں شعور کی رو کے ذریعے فرد کی زندگی اور اس کی ذہنی و جذباتی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ شعور کی رو میں

فرد کی ذہنی سطح متحرک ہو کر زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو جاتی ہے اور ماضی کی یادوں کے ساتھ ساتھ حال کی عکاسی اور مستقبل کے خوابوں کی جھلک پیش کرتی ہے۔ خیال جس طرف چاہے نکل جائے، حال سے ماضی میں ماضی سے حال میں شعور کی رو سے ملتی جلتی ایک اور صورت سرئیلزم surrealism ہے یہ دراصل انسانی ذہن کے ان سربستہ رازوں کی ترجمان ہے جو لاشعور میں چھپے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان کہتے ہیں:

> "فرائیڈ کی خوابوں کی تشریح اس نئے رجحان کی علمی بنیاد بن گئی کیونکہ لاشعور کی نامعلوم دنیا کی سیاحت روزمرہ کی حقیقت سے آگے منطق کی جکڑبندیوں سے دور کسی مطلق صداقت کی تلاش ثابت ہوئی۔ اس طرح سرئیلزم ایک مہم تھی جس میں خواب میں چیزوں کی بدل جانے والی اشکال اور معروض اور موضوع کے ایک دوسرے میں مدغم ہونے کا تماشا دکھائی دیتا ہے۔ فرائیڈ کی نفسیات میں جنسی محرکات کی اہمیت نے بھی اس سفر کی نہج متعین کی۔"(۴)

سرئیلزم انسانی نفسیات کی درست اور جاندار ترجمانی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس حوالے سے لاشعور میں ڈوب کر لکھی گئی تحریریں ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ انسان کے بیشتر اعصابی امراض اور ذہنی الجھنوں کی بنیاد بچپن میں ہی پڑ جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے بچے کی زندگی کے ابتدائی سال بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر اس کی صلاحیتوں کو کچل دیا جائے تو بچے کی شخصیت پر بہت سے ناخوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں اور بچہ اپنی زندگی میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

سماج میں زیادہ تر لوگ دوہری شخصیت رکھتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں اور اصل شخصیت نقاب میں رکھتے ہیں۔ دوہری شخصیت انسان کی سماجی زندگی پر اثرات مرتب کرتی ہے۔ انسان معاشرے کے سامنے مختلف روپ میں آتا ہے مگر حقیقت میں مختلف کردار کا مالک ہوتا ہے۔ ماہر نفسیات کے مطابق یہ رویہ ذہنی پریشانیوں کا باعث بنتا ہے۔ ذہنی صحت کی نشانی ہے کہ انسان حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے۔ بصورتِ دیگر وہ ماحول کے مطابق زندگی نہیں گزار سکے گا اور ناکام ہو جائے گا۔ ژونگ کے نزدیک شخصیت کی ایک اور مثال آرکی ٹائپ ہے، جو نقاب کے اُلٹ ہے۔ اس سے مراد شخصیت کے وہ پہلو ہیں، جنہیں ایک فرد اپنے تئیں کمتر

گردانتا ہے اور ان پہلوؤں کو اپنی شخصیت کا حصہ تسلیم کرنے سے گریز کرتا ہے۔ ان پہلوؤں میں وہ دبی ہوئی خواہشات اور جذبات شامل ہیں جن کو فرد کا شعور قبول ہی نہیں کرتا اور وہ ان عناصر کو دوسرے سے چھپانا چاہتا ہے۔ وہ شخص ذہنی طور پر صحت مند ہوتا ہے جو اپنے سائے کو قبول کرتا ہے یعنی اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے آگاہی حاصل کرکے ان کو تسلیم کرتا ہے۔ ژونگ کا ایک اہم نظریہ پرسنالٹی شخصیت کا ہے۔ اس کے نزدیک شخصیت دو طرح کی ہوتی ہے۔(i)دروں بیں Introvert (ii)بیروں بیں extrovert

دروں بیں شخصیت کے حامل افراد بیرونی چیزوں اور لوگوں سے کم دلچسپی رکھتے ہیں۔ دروں بیں شخصیت میں نفسی توانائی اندر کی طرف یعنی نفس کی جانب مائل ہوتی ہے۔ بیرون بیں شخصیت کے حامل افراد دوسرے افراد، واقعات اور چیزوں میں دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے افراد کی موجودگی میں جھجک محسوس نہیں کرتے اور بیرون بیں شخصیت میں نفسی توانائی باہر کی جانب یعنی بیرونی دنیا کی طرف جاتی ہے۔ مگر ژونگ کے خیال میں دروں بیں اور بیروں بیں دونوں قسم کے حامل افراد صحت مند ہوتے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

انسان چار چیزوں تجسس، تفکر، وجدان اور احساس کی مدد سے ماحول کے ساتھ تعلق استوار کرتا ہے۔ بچے کی ذہنی تربیت میں ان حالات کا بہت عمل دخل ہوتا ہے جن میں اس کی پیدائش ہوتی ہے اور جن میں وہ پروان چڑھتا ہے۔ پہلے بچے کو اس وقت تک توجہ دی جاتی ہے جب تک دوسرا بچہ پیدا نہ ہو جائے۔ دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد پہلے بچے کو کم توجہ ملتی ہے۔ جس سے اس بچے میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے والدین اور بعد میں دوسرے لوگوں سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ ایسے بچے ماضی میں بہت دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ اس وقت انہیں بہت توجہ ملتی تھی زیادہ تر "نیوراتی" میں شرابی اور جنسی بے راہ روی کا شکار پہلوٹھی کے بچے فرسٹ چائلڈ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسرا یا درمیانہ بچہ عموماً غفلت زدہ بچہ ہوتا ہے۔ اسے عموماً بڑے بہن بھائیوں کے استعمال شدہ کپڑے اور کھلونے وغیرہ ملتے ہیں اور وہ توجہ نہیں ملتی جو پہلے بچے کو ملتی ہے۔ اس لیے ایسے بچوں میں احساس کمتری خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ پہلے اور آخری بچے کے مقابلے میں درمیانہ بچہ ذہنی صحت کے لحاظ سے بہت بہتر ہوتا ہے۔ آخر میں سب سے چھوٹا بچہ بگڑا ہوا بچہ ہوتا ہے۔ اسے والدین کے علاوہ اس کے بڑے بہن بھائی کا لاڈ پیار بھی ملتا ہے۔ اس لیے ایسے بچے عموماً problem child بن

جاتے ہیں اور بڑے ہو کر ذہنی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بقول اصغر ندیم سیّد:

"نفسیاتی تنقید نفسیات کے علم کے ذریعے کرداروں اور سوسائٹی کو سمجھنے کا ایک زاویہ اور پیمانہ وضع کرتی ہے۔ جس سے ہمیں کرداروں کی نفسیات جاننے کا موقع مل جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں نفسیات بے حد اہم ہو چکی ہے۔ جس سے ہم بہتر نتائج اخذ کر کے معاشرے کو صحت مند بنا سکتے ہیں۔"(۵)

ب۔ کردار اور کردار نگاری:

کردار فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی: فرد کی چال ڈھال، اس کا اخلاق، کام روش، طریقہ، رنگ وغیرہ ہیں۔ کردار اچھی اور بُری خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں فرہنگِ آصفیہ کے مطابق:

"کردار: طرز،، روش،، طور، طریقہ، قاعدہ / شغل، کام عمل، دھندا / برا بھلا کام کرنا، چلن، رویہ، عادت، خصلت، برتاؤ، خوبا۔ جیسے ہر شخص کی رفتار و کردار جدا ہے۔"(۶)

انگریزی میں اس کے لئے character کا لفظ ا استعمال کیا جاتا ہے۔ ابراہم لنکن کے نزدیک ساکھ ایک سایہ جب کہ کردار ایک درخت ہے۔ کردار ایک شخص کی تمام زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ کردار نگار اپنے کردار میں جامعیت پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے کردار کو نا صرف جدت بخشتا ہے بلکہ اس کا تعلق ایک عہد اور ایک زمانے سے جوڑتا ہے۔ ادب پارے میں کردار سے مراد فرد ہوتا ہے۔

"کہانی کے واقعات جن افرادِ قصہ کو پیش آتے ہیں، انہیں اصطلاح میں کردار کہا جاتا ہے۔ ایسی ہر صنف جس میں کہانی کا دخل ہو لازماً کرداروں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ چناں چہ کسی داستان، ناول، افسانے، ڈرامے یا کسی منظوم کہانی پر بحث کرتے ہوئے اور اس کے ادبی مقام کا تعین کرنے کی غرض سے ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے مصنف نے کتنے زندہ کردار تخلیق کیے ہیں اور کردار نگاری کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔"(۷)

کردار نگار کے تخلیق کردہ کردار انسانی زندگی کے قریب ہوتے ہیں۔ یہ عام انسانوں جیسے ہوتے ہیں

اور ان سے مختلف بھی ہوتے ہیں۔ ادب میں کردار نگاری کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ ادب کی دنیا میں بہت سے ایسے کردار تخلیق ہوئے، جنہیں آفاقی شہرت حاصل ہوئی اور وہ آج تک زندہ و جاوید ہیں۔ کردار نگار قصہ اور کہانی کو دلچسپ اور مؤثر بنانے کے لیے اپنے کردار کو اپنی تخلیقی مہارت کے ذریعے جاندار، خوبصورت اور دلچسپ بناتا ہے۔ چناں چہ ضروری ہے کہ کردار نگار عمدہ تخیل، وسیع مطالعہ اور مشاہدہ کا حامل ہو۔ اسی باعث وہ عمدہ کردار تخلیق کر سکتا ہے۔ فن کار کردار تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی منشاء کے مطابق اس میں تبدیلی بھی لاتا ہے۔ فن کار ہمیشہ کردار کو حقیقی زندگی سے ہی تخلیق کرتا ہے اور اس کا کردار عام معاشرے سے تعلق رکھتا ہے۔ کردار افسانوی ادب کا لازمی جزو ہے۔ کرداروں کے باعث ہی کہانی تکمیل کے مراحل طے کرتے ہوئے انجام تک پہنچ جاتی ہے۔ کردار عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ مرکزی یا بنیادی کرداراور ثانوی کردار۔

i۔ مرکزی کردار:

کسی بھی قصہ یا کہانی میں شروع سے آخر تک نمایاں رہنے والا کردار مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سب سے اہم کردار ہوتا ہے۔ اس کردار کو کہانی میں آنے والی تمام آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کہانی میں ہیرو ہیروئن کا کردار ہمیشہ اچھائی کا لبادہ اوڑھے ہوئے سامنے آتا ہے۔ اس کے مخالف جو بھی کردار آتا ہے وہ کردار ولن کا کردار ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ شر اور بدی کا نمائندہ ہوتا ہے۔

ii۔ ثانوی کردار:

یہ کردار ایسے ہوتے ہیں جو کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کرداروں میں ضمنی کردار آتے ہیں جو کہانی میں کچھ دیر کے لیے ظاہر ہوتے ہیں اور پھر پسِ منظر میں چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ضمنی کردار بنیادی کرداروں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

کرداروں میں متحرک، جامد، تمثیلی اور علامتی کردار بھی شامل ہیں۔ متحرک کو round کردار بھی کہتے ہیں جو کہانی کے مطابق اپنے آپ کو بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اظر یا قاری میں تجسس بڑھتا ہے۔ جبکہ جامد کرداروں میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے۔ یہ شروع سے لے کر آخر تک اپنی ایک ہی ادا کو برقرار

رکھتے ہیں۔

کینیڈے کا کہنا ہے کہ:

"Flat characters tend to stay the same throughout a story, but round character often changes. Learn or become enlightened, grow or deteriorate."(۸)

یہ کردار ہی ہیں جو انسانی فطرت، تہذیب اور معاشرت کے عکاس ہوتے ہیں۔ جتنے یہ کردار عام زندگی سے قریب ہوں گے اتنے ہی وہ فطرت کے قریب ہوں گے۔ بعض اوقات ادب میں ایسے کردار بھی نظر آتے ہیں جن میں مافوق الفطرت خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اس طرح کے کردار ہمیں داستانوں اور مثنویوں میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ علامتی کردار ہیں جو استعارے اور کنایے کا انداز لیے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ اردو ڈرامے میں کرداروں کی سبھی اقسام پائی جاتی ہیں۔ جس سے ڈراما ارتقا کے مراحل طے کرتا ہوا تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔

ج۔ مردانہ کرداروں کا نفسیات کے تناظر میں مطالعہ

مرد اور عورت زندگی کے مرکزی کردار ہیں۔ زندگی ان دونوں کرداروں کے دم سے ہی رواں دواں نظر آتی ہے۔ ہمارا ادب بھی مرد و عورت کے رنگین موضوعات کی عکاسی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ادب کرداروں کی نفسیات کو معاشرتی آہنگ میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ ان کو پرکھنے کے لیے دور جدید کے تقاضوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ مرد ہو یا عورت آج کے اس سائنسی اور مشینی دور میں دونوں کے مزاج الگ ہی نظر آتے ہیں۔

ڈرامے کے حوالے سے دیکھا جائے تو کہانی مرد اور عورت کی گرد گھومتی ہے۔ مرکزی کردار ادا کرنے والا اداکار ہیرو کہلاتا ہے۔ بعض اوقات ڈرامے میں ایک کے بجائے دو ہیرو بھی ہوتے ہیں۔ جس سے ڈرامے میں تجسس کو اور بڑھاوا دیا جاتا ہے۔ ہر عہد میں مخصوص قسم کے ہیرو جنم لیتے ہیں۔ ان ہیرو کے کردار کے آئینے میں اس عہد کی اقدار اور معاشرتی احوال کا سراغ ملتا ہے۔ ڈراما چوں کہ فوری ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔

اس کے لیے ہیرو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے جو اپنے کردار پر پورا اترے اور مکمل طور پر کہانی پر چھایا ہوا نظر آئے۔

"خدا زمین سے گیا نہیں ہے" ڈرامہ پاکستانی فوج کے گرد گھومتا ہے۔ فوج کے جوان الگ الگ اپنا کردار ادا کرتے جاتے ہیں۔ پاکستانی فوج ملک کا نام برقرار رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ میں امن کا جھنڈا دشمن کے خلاف لڑتی نظر آتی ہے۔ مردانہ کرداروں کی نفسیات کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو نڈر، بہادر، جرأت اور حوصلے سے پھرپور کردار سامنے آتے ہیں۔

ڈرامے کا آغاز فوجی آپریشن سے ہوتا ہے۔ جس میں فوجی جوان دہشت گردوں کے ٹھکانے پر حملہ کرتے ہوئے، خودکش بم کو ناکارہ بناتے ہیں۔ ان نوجوانوں کے چہرے پر پریشانی ہویدا ہے۔ مگر وہ اپنے فرض کو جرأت اور حوصلہ مندی سے نبھاتے ہیں۔ رحمان گل کا کردار اعلیٰ اخلاق کا علمبردار ہے اور بلند سوچ کی ترجمانی کرتا ہے۔ پہلی قسط میں ہی جب رحمان گل کی بیٹی عورت کی دوسری شادی کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ یوں کہتا ہے: رحمان گل:

> "کیوں نہیں ہے بیٹا اسلام میں بیوہ سے شادی کرنے کا ثواب ہے، اور اگر بیوہ کے بچے بھی ہیں تو اس کا تو بہت ہی اجر ہے۔"(۹)

اس ڈرامے میں مرد کردار فوج کے جوانوں کی حیثیت سے بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کہیں مسجد کے عالم دنیا کی حقیقت بتاتے نظر آتے ہیں۔ اس ڈرامے میں معاشرہ بے راہ روی کا شکار بھی نظر آتا ہے۔ پاکستانی معاشرہ پست رواجوں کی ایک کھٹالی بھی ہے۔ یہاں دین کے نام پر لوگوں کے، زندگیوں اور جسموں کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ لوگوں کو دین کے نام پر گمراہ کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک جاندار کردار جو ایک شاطرانہ سوچ کا لبادہ اوڑھے ہوئے سامنے آتا ہے۔ مولوی اللہ بخش کا ہے جو بظاہر مدرسے کا مولوی سربراہ ہے۔ مگر دین کے نام دہشتگردوں کو تیار کرتا ہے، لوگوں کو جنت کی بشارت دیتا ہے اور ان کے ذہنوں سے بڑے شاطرانہ انداز سے کھیلتا ہے۔ مولوی اللہ بخش ایک جاندار کردار ہے۔ بظاہر نیک طینت مگر درپردہ دہشت گردوں کے سربراہ خائستہ گل کے زیر اثر اپنا کام سرانجام دے رہا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں سے کچھ یوں مخاطب ہے:

> "اللہ بخش: اوں تسا شہر ڈیھٹا نئیں، اوں تساں اپنی بستی توں کدی بارا ی نئیں

گئے، ہوائی جہاز ڈیکھٹا نے، ریل گڈّی ڈھٹی، ہاہاہااے ویکھنا وی نئیں بالکل وی نئیں

ویکھنااے، دنیا جھوٹ، فریب دی چس اے، اے ہدایت دا سمندر ہے، جد انصیب

ہے جناں فیض یاب ہو ونجھے "(۱۰)

اللہ بخش لوگوں کو دوزخ کے عذاب کی جھلک دکھاتے ہوئے، جنت کی دودھ اور شہد کی نہروں کی تصویر دکھاتا ہے۔ جس سے لوگوں کے اندر جنت کی تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ جنت کو پانے کے لیے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ انسان جس چیز کی خواہش کرتا ہے اس کو پانے کی چاہ میں سرگرداں رہتا ہے۔ شاطر لوگ پہلے ان سادہ لوگوں کی خواہشات جان لیتے ہیں اور پھر ان کی پسندیدہ چیزوں کا لالچ دے کر ان کو گمراہ کیا جاتا ہے۔ عام سادہ لوگوں کی نفسیات کو جاننا آسان ہوتا ہے۔ وہ ناپختہ ذہن اور سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی سوچ کو بدلنا آسان ہوتا ہے۔ وہ ایک علاقے تک محدود رہتے ہیں۔ انہوں نے دنیا کو نہیں دیکھا ہوتا جس کی وجہ سے وہ دوسروں پر جلد بھروسا کر لیتے ہیں۔ یہی سب ہمیں اس ڈرامے کے ذریعے بھی دکھایا گیا ہے۔

قبائلی علاقے میں عورتوں کو حقیر جانا جاتا ہے۔ ایک میاں بیوی اپنے بچے کو مدرسے میں داخل کروانے کے لیے لے کر جاتے ہیں، تو اللہ بخش دو سال بعد ملنے کی شرط رکھتا ہے۔ اس سے عورت انکار کرتی ہے تو اللہ بخش جلال میں آکر مرد کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ: "اللہ بخش: عورت کوڑھ مغز ہوتی ہے، عقل مغز نہیں ہوتی، عقل پیچھے ہوتی ہے۔"(۱۱)

دوسری طرف خائستہ گل جیسے پست ذہنیت والے شاطر انسان نے اپنی بیٹی کو غلام بنا کر قید کر لیا ہے۔ خائستہ گل ایک مطلق العنان بادشاہ کا روپ دھار کر اپنا قانون بناتا ہے۔ وہ اپنے ہر عمل اور ہر قانون کو سچا اور کھرا کہتا ہے۔ خائستہ گل نے ڈرامے میں ولن کا کردار ادا کیا ہے۔ وہ ملک کا دشمن ہے۔ پاک سرزمین میں نفرت، عناد اور تعصب کا بیج بوتا ہے اور مذہب اسلام کو اپنے اوچھے ہتھکنڈوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کی ظاہری وضع قطع جابر بادشاہ کی سی ہے۔ جو اپنے حکم کا اکا رائج کر کے خود کو مطلق العنان بادشاہ ثابت کرتا ہے۔

ایسے لوگ نفسیاتی پیچیدگی کا شکار اور غیر صحت مند ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ نفسیات دانوں کے نزدیک

"جب ہم غیر صحت مند ذہن کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ

ایک شخص کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہے۔ خواہ اس کی نوعیت معمولی ہو یا سنگین اگر کسی

شخص کا ذہن صحت مند نہیں ہے تو وہ سماج دشمن کردار کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے اس کے علاوہ منشیات کا عادی ہو سکتا ہے۔"(۱۲)

اس کے علاوہ

"ہر سماج میں ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو نہ مجنوں میں آتے ہیں نہ عصباتی میں ،ذہنی طور پر کمزور بھی نہیں ہوتے، پھر بھی نہ تو ماحول سے مطابقت پیدا کر پاتے ہیں، نہ ہی اپنے آس پاس کے لوگوں کے ساتھ مل کر پر سکون طریقے سے رہ سکتے ہیں۔ ان کی حرکتیں دوسروں کے لیے جھنجھلاہٹ و ناگواری کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔ اس صورت میں یہ سماج دشمن سماج مرضیاتی شخصیت کے تحت آتے ہیں سماج مرضیاتی شخصیت کے حامل افراد عموماً خاصے ذہین ہوتے ہیں۔"(۱۳)

خائستہ گل ایسا ہی ایک کردار ہے۔ اس کی نظر میں اس کا ہر فعل اور عمل سچا ہے۔ وہ بیرونی طاقتوں کے ساتھ مل کر اپنے ہی ملک کو غلط اور اس کے نظام کو بدتر قرار دیتا ہے۔ وہ ملک کے مخلوط نظامِ تعلیم کو کفر کہتا ہے۔ اس کے نزدیک عورتوں کا پڑھنا لکھنا جائز نہیں ہے۔ وہ مذہب کو پھیلا کر فحاشی و عریانی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ اسی سبب اس نے دہشت گردی کا مکروہ راستہ چنا ہے۔ خائستہ گل کا رعب و دبدبہ اس کی شخصیت اور اس کے مکالموں سے نظر آتا ہے۔

انسان کا ہر فعل و عمل اس کی نفسیات کے تابع ہوتا ہے۔ خائستہ گل بھی اپنے فعل و عمل کو اپنی نفسیات کے مطابق ادا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بظاہر یہ ایک فرضی کردار ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں آج بھی ایسے ہی خالص حقیقی کردار قبائلی علاقوں میں نظر آتے ہیں۔ خائستہ گل مدرسے کے چندے کے نام پر بھتہ وصول کرتا ہے۔ جس میں وہ اپنے سگے بھائی کو بھی نہیں بخشتا۔ خائستہ گل کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ وہ کے نظام کو رائج کرنے کا حامی ہے مگر اپنے بیٹے کے موسیقی سننے پر برہمی کا اظہار نہیں کرتا۔ وہ اپنے مفاد کے لیے عورت کی خریداری کو غلط نہیں گردانتا۔

انسانی نفسیات ایک وسیع علم ہے، جو صرف زندگی کے ایک گوشے کو پرکھنے سے حاصل نہیں ہوتا، اس کے لیے زندگی کے ہر پہلو کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اسی طرح کرداروں کی نفسیات کا جائزہ لینے کے لیے یہ

جاننا اہم ہے کہ وہ کردار کیوں کر، کیسے اور کن حالات میں وجود میں ہے۔ جیسا کہ یہ کہانی دو بھائیوں کی ہے۔ ان دونوں کی شخصیات پر ابتدائی زندگی کے حالات نے مختلف انداز میں اثر چھوڑا ہے۔ ایک والدین کی اولاد مختلف عادات کی مالک ہوتی ہے۔ ایسا ضروری نہیں ہے کہ جیسے ماں باپ ہوں، بچے بھی انہی عادات کو اپنائیں ۔ بچے اپنے ماحول سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ بعض اوقات ماحول ہی بچوں کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ خائستہ گل اور رحمان گل دونوں بھائیوں کی زندگی نے پلٹا اس وقت کھایا، جب ان کی ماں بیمار تھی اس وقت ان دونوں نے اپنے باپ کا جارحانہ روپ دیکھا۔ ان کا باپ، ماں کو کسی طبیب کے پاس لے کر نہیں جاتا اور اسے سسک سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے اس کا کہنا ہے کہ: "باپ: ہمارے یہاں کی عورتیں غیر مردوں سے علاج نہیں کرواتیں"(۱۴)

جب رحمان گل اور خائستہ گل باپ سے جھگڑا کرتے ہیں تو ان کا باپ انہیں مارتا پیٹتا ہے اور پھر کچھ ہی عرصے بعد ماں کا انتقال ہو جاتا ہے تب بچوں کے مکالمے ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ زندگی کے حادثات کس طرح کسی ایک انسان کی شخصیت پر مختلف طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

"رحمان گل: ماں تو مر گئی یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں اب میں ڈاکٹر بنوں گا اور اسی گلی کے باہر دکان کھولوں گا۔

خائستہ گل: کیسی! کیسی باتیں کر رہے ہو، جس نے ہماری ماں کو مارا ہے۔ میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا بدلہ لونگا بدلہ لے!(غصے میں)

رحمان گل: کس سے بدلہ لو گے بدلہ لینے سے بہتر ہے ہم ایسے کام کریں کہ کسی کے ساتھ ایسا نہ ہو۔(نصیحت کرتے ہوئے)

خائستہ گل: میں بتاؤں گا اور بدلہ لوں گا ان لوگوں سے جو ہمیں کھانے کو نہیں دیتے تھے۔

رحمان گل: میں گھر چھوڑ رہا ہوں ادھر بیٹھا رہا تو کچھ نہیں بنے گا شہر جا کے کام کروں گا پڑھوں گا۔

خائستہ گل: نہیں میں تو افغانستان جاؤں گا ادھر لڑوں گا۔

رحمان گل: ایسا نہ کرو میرے ساتھ چلو۔

خائستہ گل: تم بزدل ہو تم سب بزدل ہو (کھڑے ہوتے ہوئے)

رحمان گل: خائستہ گل آہستہ، رکو، رکو۔۔۔۔۔۔"(۱۵)

یہ وہ چند مکالمات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں نے الگ لگ راہ چن لی ہے۔ ان دونوں کرداروں پر اس واقعے نے الگ الگ انداز میں اثر ڈالا ہے۔

"ایک شخص ایسی حرکتیں کرتا ہے جن سے دوسروں کو یا خود اپنی ذات کو نقصان پہنچا رہا ہے تاہم یہ کہ اس کی شخصیت پر ایک آئی ڈی حاوی ہے۔ دوسری طرف ایک اور شخص ہے جس کے اندر انتہائی درجے کی ندامت اور احساسِ جرم حاوی ہے۔ اس کے اندر اپنے شدید نااہل اور بے معنی ہونے کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔۔۔ اس کی شخصیت پر فوق الانا کا غیر معمولی غلبہ ہے۔ اس کی فوق الانا جو ابنارمل حد تک طاقتور ہے لاشعوری طور پر اس کے ان ناکردہ گناہوں کے لیے اس پر لاشعوری احساسِ جرم کے کوڑے برساتی رہتی ہے"(۱۶)

خائستہ گل ناپختہ ذہن کا جذباتی لڑکا ثابت ہوا۔ جس نے اپنا آپ ناکامی کے سپرد کر دیا تھا۔ زندگی حوادث کا مجموعہ ہے۔ بہت سے لوگ یا تو کامیاب ہو جاتے ہیں یا پھر ناکام۔ وہ اپنے حالات و واقعات سے سیکھتے ہیں اور سکھاتے ہیں۔ کوئی اچھا سیکھ جاتا ہے، کوئی برا۔ ایسا ہی خائستہ گل اور رحمان گل کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ رحمان گل ڈاکٹر نہ بن سکا مگر ایک کامیاب کاروباری ضرور بن گیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنایا اور دوسرے کو فوج میں بھرتی کروایا۔ جبکہ بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ رحمان گل کا گھرانہ سادہ مگر پُر مسرت زندگی بسر کرتا ہے۔

خائستہ گل ماں کا انتقام لینے کے لیے غلط راہ پر چلتا ہے۔ وہ ایک لاابالی ذہن کا نوجوان تھا، جس پر بھوک پیاس کی شدت بھی اثر دکھاتی ہے تو باپ کی مار پیٹ بھی، یہی وہ عوامل تھے جو بچے کے بچپن کو نگل گئے اور اس نے غلط راہ چن لی۔ بچوں کی شخصیت ایک کھلی کتاب جیسی ہوتی ہے۔ وہ اپنا ہر عمل اور ہر احساس کو پردے میں نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ بچہ حساسیت میں ہر صحیح و غلط کام کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس میں

تجسس بھی ہوتا ہے اسی تجسس کی بنا پر وہ نئی چیزیں نئی راہیں ڈھونڈتا ہے۔ یہ بچوں کا سب سے دلچسپ عمل ہوتا ہے۔ ایسے ہی عمل سرانجام دیتے ہوئے بچہ اپنی مخصوص شخصیت کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی شخصیت انسان سے اچھے برے افعال سرانجام دلواتی اور انسان کی سوچ پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس کردار کی تہیں تہہ دار اور پُر پیچ ہوتی ہیں۔ اس کردار کا معاشرتی اور نفسیاتی تصادم (conflict) حالات کی تبدیلی کے ساتھ اور گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہی صورتِ حال خائستہ گل کے کردار پر لاگو ہوتی ہے اور اس کے اصول اپنے بیٹے کے وقت بالکل بدل جاتے ہیں۔ جب وہ جہاد پر جانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنے بیٹے کی موت کے بارے میں سوچ کر ہی دہل جاتا ہے اور پریشانی کے عالم میں روتے ہوئے بولتا ہے:

"زرگل: بابا تم ہم کو مشکل کام کرنے سے روکتا کیوں ہے۔ اب ہم زیادہ دیر جنت سے دور نہیں رہ سکتا تم ہم کو بتاتا کیوں نہیں ہے ہمارا منظوری ہو چکا ہے۔ ہم کو رات کو جنت سے آوازیں آتی ہیں۔

خائستہ گل: (نہایت برہمی سے) جو تم کو حکم دیا ہے تم وہ کرو، تم جاؤ جا کر لڑکی کو لے کر جاؤ! جاؤ ادھر سے۔"(۱۷)

اس کردار میں ہمیں بے قراری اور ہیجان کی کیفیت ہمہ وقت موجود دکھائی دیتی ہے۔

خائستہ گل: زرگل بچے او خدایا لاکھ لاکھ شکر (گلے ملتے ہوئے چومتے ہوئے) تم کدھر چلا گیا تھا ہم کو بنا بتائے (نہایت غصے میں) تم کو ہم نے منع کیا تھا منع کیا تھا کہ یہ خودکش جیکٹ مت پہنو تمہارے لیے حکم نہیں ہے۔ تمہارا کام اور ہے تمہیں کسی اور کام کے لیے چنا گیا ہے۔ بچے تم خدا کو ناراض کر رہا ہے۔"(۱۸)

اسلام کی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جب مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے فوجی دستوں نے بڑی بڑی افواج کو لمحوں میں شکست دی۔ طالبان جس پھرتی سے افغانستان پر قابض ہوئے تھے، اس سے عسکری ماہرین چاہے متاثر نہ ہوئے ہوں لیکن انہوں نے جس تیزی سے لڑکیوں کے اسکول بند کیے، عورتوں کو گھر کی چار دیواری تک محدود کیا، مردوں کو داڑھی رکھنے پر مجبور کیا، ریڈیو اور ٹیلی ویژن توڑ ڈالے، کھیلوں اور موسیقی سمیت تفریح کے کئی ذرائع پر پابندی لگائی، اس سے دنیا سکتے میں آ گئی۔ ان کی زندگی انتشار کا شکار تھی۔ ان کا گھریلو ماحول اور عائلی زندگی

جذباتی تسکین سے عاری تھی، کوئی ماں کی نرم آغوش سے محروم تھا تو کسی کے سر پر باپ کا سایہ نہ تھا جو اسے زمانے کے سرد و گرم سے تحفظ دیتا اور زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتا۔ پاکستانی علما نے رضاکارانہ طور پر مدرسے قائم کیے جہاں وہ پڑھتے تھے اور اسی وجہ سے طالبان کہلائے۔ افغانستان میں جو طالبان برسر اقتدار تھے ان کی اچھی خاصی تعداد پاکستان میں زیر تعلیم انہی طلباء پر مشتمل تھی۔

انہوں نے زندگی کے تلخ حقائق میں سانس لیا۔ وہ دور اندیشی سے ناواقف تھے۔ پاکستان کے مدرسوں میں انہوں نے سائنس، اقتصادیات، ریاضی، تاریخ یا جغرافیہ کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ وہ نہ ہی عالمی سیاست کو سمجھتے تھے اور نہ ہی انہیں افغانستان کی تاریخ یا جنگ کے بارے میں کوئی علم تھا۔ ان کی زندگی ان کے تئیں اسلامی تعلیمات کے گرد گھومتی تھیں اور ہر مشکل میں وہ خدا کو ہی یاد کرتے تھے۔ ایک بار طالبان کے ساتھ سفر کے دوران ان کی باتوں سے احمد رشید کو احساس ہوا کہ طالبان میں بیشتر کا تعلق ایک ایسی نسل سے تھا جس نے زمانہ امن میں اپنا ملک نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے گاؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگ کس طرح مل جل کر رہتے ہیں انہیں اس کا کچھ بھی اندازہ نہیں تھا۔ جنگ نے انہیں جو کچھ سکھایا وہ بس اسی کے بارے میں جانتے تھے۔

طالبان کی ذہنی کیفیات کیا ہے! ان کی نفسیات نے کن حالات میں تشکیل پائی، طالبان اپنے آبا و اجداد کے روایتی پیشوں سے ناواقف تھے۔ کاشتکاری کیسے کی جاتی ہے، مویشی کیسے پالے جاتے ہیں، دستکاری کیسے ہوتی ہے، انہیں اس کا کچھ بھی علم نہیں تھا۔ انہوں نے کبھی اپنی آنکھوں کے سامنے ایک ہی گاؤں میں مرد اور عورت کو بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی سوچ محدود تھی۔ وہ گھر بار رشتوں ناتوں سے ناواقف زندگی گزار رہے تھے۔

ہمارے پاس اسی ڈرامے کا دوسرا جاندار کردار خائستہ گل کے بیٹے زرگل کا ہے۔ جو اپنی خاموش طبع کے باعث پرزور آواز ثابت ہوتا ہے۔ زرگل ایک ایسے جوان کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ جس کے پاس اپنا کچھ نہیں۔ وہ بس اپنے باپ کے حکم کے تابع ہر کام سرانجام دیتا ہے۔ اس کا کام صرف لوگوں کو ادھر سے ادھر پہنچانا ہے۔ اس کے نزدیک اس کا باپ ایک فرشتہ صفت انسان ہے جو کافروں کے خلاف جہاد کر رہا ہے۔ وہ اپنی بہن کو بھی یہی کہتا ہے، کہ بابا کا حکم مانو بابا جنت میں جائے گا۔ زرگل ایک ایسے ناپختہ ذہن کا ترجمان ہے۔ جس کو صرف اور صرف باپ کا حکم ہی سنائی دیتا ہے۔ جب وہ خائستہ گل کی ریکارڈنگ سنتا ہے تو اس میں جنت کو دیکھنے کا تجسس بڑھ جاتا ہے۔ خائستہ گل اپنے جوانوں کو بتاتا ہے، کہ کافروں کو مارنے سے جنت ملے گی۔

بم دھماکوں سے پہلے اللہ اور حضور کا دیدار ہو گا۔ اسی تجسس کی بنا پر زرگل اپنے آپ کو دماغی طور پر جہاد کے لیے تیار کرتا ہے اور پھر اپنے باپ کو بھی یہی کہتا ہے کہ میں جہاد کے لیے تیار ہوں۔ جس پر خائستہ گل برہمی کا اظہار کرتا ہے۔ پھر ایک دن زرگل خودکش جیکٹ پہن کر بم دھماکے کرنے کے لیے نکل جاتا ہے۔ جب وہ لاہور کی سڑکوں پر مناسب جگہ تلاش کر رہا ہوتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہاں تو کوئی کافر نہیں سب مسلمان ہے سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ کوئی بے حیائی نہیں ہے پھر وہ ایک مسجد میں آتا ہے جہاں نمازی نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ ایسے میں اس پر آشکار ہوتا ہے کہ سب اللہ اور اس کے رسول کے ماننے والے ہیں۔ پھر وہ سوچتا ہے کہ مجھے جنت کیوں نظر نہیں آرہی مجھے اللہ اور حضور کا دیدار کیوں نہیں ہو رہا۔ اسی باعث وہ جان جاتا ہے کہ، اس کا باپ اسے اور بہت سے لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے۔ اس کا باپ حملہ آوروں کو نشے کی دوائی پلا کر بھیجتا ہے۔ جس سے ان کے دماغ بند ہو جاتے تھے۔ اسی باعث وہ شدید دکھ کی حالت میں باپ کے پاس پہنچ جاتا ہے اور پھر اسی کردار کے باعث کہانی کا ولن اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

"زرگل: تم تو بولتا تھا دھماکے سے پہلے جنت نظر آئے گی۔ حضور نظر آئیں گے مگر ہمیں تو کچھ نظر نہیں آیا۔

خائستہ گل: جس کے لیے حکم ہوتا ہے بچے اس کے لیے ہوتا ہے۔ تمہارے لیے اور حکم ہے۔

زرگل: ہم نے ان کو قریب سے دیکھا ہے بے ضرر معصوم بچے، عورتیں اپنا روزی کمانے میں مصروف ہم ان کو کیوں مار رہے ہیں۔

خائستہ گل: کس سے مل کر آرہے ہو۔

زرگل: اپنے لوگوں سے

خائستہ گل: جو کافر کا ساتھی ہوتا ہے وہ بھی کافر ہوتا ہے۔ اس کے لیے بھی یہی سزا ہے جو کافر کے لیے۔۔

زرگل: پھر ہم کو حضور کیوں نظر نہیں آئے۔

خائستہ گل: وہ بچہ اس لیے حکم نہیں ہے۔

زرگل: حکم نہیں تھا یا نشے والا شربت نہیں تھا۔

خائستہ گل: (برہمی سے) تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے تم کیسی باتیں کر رہا ہے۔ ایسا بات مت کرو باہر جائے گا لوگ ہم کو مارے گا۔

زرگل: ہم کو جنت نظر آرہا ہے بابا

خائستہ گل: ڈرتے ہوئے دیکھو بچے ایسا بات نہیں کرو۔

زرگل: ہم کو اشارہ مل گیا ہے چلو نہ بابا دنیا فانی ہے! جنت پانی ہے چلو نہ دنیا فانی ہے۔

خائستہ گل: دیکھو بچہ یہ باتیں مت کر ہم کو چھوڑ دو تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

زرگل: (باپ کو گلے لگاتے ہوئے زور سے پکڑ کر) بابا ہمیں حضورؐ نظر آرہے ہیں۔ دنیا فانی ہے، چلو نا بابا! دنیا فانی ہے

خائستہ گل بے چینی سے ہاتھ پیر ہلاتے ہوئے۔ ہم کو چھوڑ دو بچہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

زرگل: اللہ اکبر (ساتھ ہی جیکٹ کا بٹن دبا دیتا ہے)"[۱۹]

کہانی کا یہ کردار جو کہ ولن کا ہی بیٹا ہے، کہانی اپنے اختتام کو پہنچاتا ہے۔ جب اس کی آنکھوں سے جھوٹ سچ کی پٹی کھل جاتی ہے تو اپنے باپ سمیت خود کش دھماکہ کر کے ہلاک ہو جاتا ہے۔ جس سے خائستہ گل کے دیگر ساتھی بھی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ زرگل کا کردار نفسیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں کشمکش، تصادم اور تجسس پایا جاتا ہے۔ جو کہانی کو اختتام تک پہنچانے کا باعث بنتا ہے۔ جب وہ اپنے علاقے کے باہر کی دنیا میں جا کر مشاہدہ کرتا ہے تو اسے سمجھ آتی ہے کہ وہ دھوکے اور فریب میں جیتا رہا ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بعض اوقات انسان کا عمل اسے صحیح راہ پر لے آتا ہے۔ جیسے زرگل کا خود کش دھماکہ کرنے کا قصد کرنا۔ یہ ایک برجستہ عمل تھا جس کا وہ گہرا مشاہدہ کرتا ہے۔ انسان بے شک ایک لمبے عرصے تک ایک ماحول میں پلتا رہے مگر جب اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو اس کے قول اور فعل میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔

گھر کا ماحول انسانی سوچ، نفسیات اور زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ گھریلو ماحول کی بدولت ہی انسانی

کردار مخصوص سانچے میں ڈھلتا ہے۔ جیسے خائستہ گل اور حمان گل کے گھر کا ماحول الگ الگ انداز میں ان کی زندگیوں پر اثر انداز ہوا ہے۔ ایسے ہی رحمان گل کے بیٹے اسفند کا کردار بھی ہمیں نظر آتا ہے یہ ایسا کردار ہے جس پر مشرقی تربیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس مردانہ کردار میں اعلیٰ صفات دکھائی دیتی ہیں۔ اسفند ایک بھائی بھی ہے، بیٹا بھی ہے اور محافظ بھی ہے مگر اس سے بڑھ کر وہ جانباز ہے اور اسلامی روایات کی پاسداری کو اہم سمجھتا ہے۔

اسفند اپنی خالہ زاد کزن جو کہ بیوہ اور دو بچّوں کی ماں ہے، سے شادی کا خواہشمند ہے تا کہ اس کا محافظ بن سکے اور اس کی اور اس کے بچوں کی کفالت کر سکے۔ اسفند گل بانو سے شادی کا خواہشمند ہے۔ وہ اسے قائل کرنے کے لیے اسلام کا سہارا بھی لیتا ہے اور اسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہ کا حوالہ دیتا ہے۔ اسفند کا کردار حوصلہ مند، جرأت مند اور اعلیٰ سوچ کا حامل کردار ہے۔ جو اپنے عمل سے اپنی نفسیات کو منظر عام پر لاتا ہے۔ وہ صرف کہنے کا قائل نہیں بلکہ مسلسل عمل کا قائل ہے۔

ڈرامے کا ایک اور مرد کردار دتّا ہے جو بچپن سے اللہ بخش کے پاس زیر تعلیم ہے۔ جوان ہوتے ہی وہ بھی یہ خواہش کرتا ہے کہ میں بھی جنگ کروں گا میں تیار ہوں۔ اس کو تین اور ساتھیوں کے ساتھ لاہور کے گنجان آباد علاقوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کو پاک آرڈیننس فیکٹری Pak ordinance factory میں دھماکہ کرنا ہوتا ہے۔ مگر جب وہ وہاں اللہ ہو اکبر کی صدائیں سنتا ہے تو اسے یہ علم ہوتا ہے کہ میں مسلمانوں کو ہی مارنے آیا ہوں۔ دتّا کا کردار ایک ایسا کردار ہے۔ جو شروع سے ہی خاموش ہے مگر گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ کسی سے بات چیت نہیں کرتا مگر اسے اپنی ماں کی یاد ہر لمحہ ستاتی رہتی ہے۔ اس کے ماں باپ اسے اللہ بخش کے ہاں سات آٹھ سال کی عمر میں چھوڑ جاتے ہیں۔ اللہ بخش اس کے دماغ کے کورے کاغذ (blank slate) پر یہی چند باتیں ہی کندہ کرتا ہے کہ تم نے جنت میں جانا ہے، مجاہد خوش نصیب ہوتے ہیں، مرنے سے پہلے ہی اللہ اور حضور کا دیدار ہو جاتا ہے، دنیا کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر برائی ہمیشہ چھپتی نہیں کبھی نہ کبھی سامنے ضرور آجاتی ہے۔ دتّا ہمیشہ ایسی باتیں سن کر مطمئن ہونے کے بجائے اور بے چین ہو جاتا ہے۔ اسی باعث جب وہ خود کش دھماکہ کرنے جاتا ہے تو وہ یہی سوچتا ہے اور اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ پولیس اور ISI کے قابل افسران اس سے پوچھ گچھ کرتے ہیں۔

کہانی کے کلائمکس میں ایک اور مردانہ کردار صحبت خان کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ پاکستان آرمی خائستہ گل سے مذاکرات کے لیے قبیلے کے سردار سے رابطہ کرتی ہے۔ جو ایک مدّبر اور معاملہ فہم قسم کا بزرگ ہے یہ جرگہ چیف کے عہدے پر فائز ہے۔ نیک طینت اور مدبّر بزرگ ہے۔ وہ خائستہ گل کو اپنے تجربے اور دانست کے مطابق قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

"صحبت خان: ولے دیکھو جنگ میں ہر ایک بات جائز نہیں ہوتا ہے۔ دوسری طرف اپنے مسلمان بھائیوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ امن کے لیے بہت کوشش کر رہا ہے۔ دیکھو بابا تم بھی ہمارے ساتھ امداد کرو۔

خائستہ گل: ہم کو نہیں معلوم ہے کہ ہم کیا کیا ہے، ہم اپنا لڑائی خود کرتا ہے۔

صحبت خان: دیکھو ہم صدیوں سے رہ رہا ہے، تم بھی ادھر ہی رہتا ہے۔ دیکھو بابا زمین پر خسارہ، فساد پھیلائے گا تو نقصان کس کا ہو گا جب زمین پہ دو بیل لڑ رہا ہوتا ہے۔ تو نقصان تو گھاس کا ہوتا ہے نہ۔ ہم لوگ تو یہاں گھاس جیسا ہے۔

خائستہ گل: صحبت خان ہم لوگوں کا کیا ہے۔ جو کچھ بھی ہے تم لوگوں کا ہے۔ تم ادھر کا سردار ہے۔ تمہارا ادھر زمین ہے۔ تمہارا زمرد کا کان ہے۔ تم لوگوں نے ہم لوگوں کو کچھ بھی نہیں دیا ہے۔ اب ہم لوگ مانگے گا نہیں! اب ہمارا حکومت قائم ہوئے گا۔ ہم سب کچھ زبردستی حاصل کرے گا

صحبت خان: ارے بابا یہ سب کچھ تم لے لو، زمین لے لو، کان لے لو، ہمیں صرف امن دے دو، پیار دے دو۔ خائستہ گل ہمارے پٹھانوں کا ایک دستور ہے کہ ہم دشمن کی عورت کا بھی لحاظ احترام کرتے ہیں۔ دیکھو خائستہ گل تم نے غیر ملکی عورت کو یرغمال بنایا ہوا ہے اور ایک ہماری اپنی بچی کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔

خائستہ گل: بات سنو یہ غیرت ویرت ہم کو مت سمجھاؤ!(۲۰)

صحبت خان جیسے بزرگ کا کردار ناصحانہ ہے۔ اس کا اندر صاف شفاف ہے۔ وہ دوسروں کو مخلصانہ مشورہ دیتا ہے۔ صحبت خان ایک صلح جو انسان ہے۔ وہ صلح و امن کے لیے اپنی دولت تک دینے کو راضی ہو جاتا

ہے۔یہی ناصحانہ انداز صحبت خان کے کردار کو جاندار بناتا ہے۔اسی باعث ہمیں اس کردار کی نفسیات کا علم ہوتا ہے۔ منفی مردانہ کرداروں میں اس ڈرامے کے حوالے سے ہمارے پاس تین کردار سامنے آتے ہیں۔ ایک جو نوجوان لڑکوں کو گھیر کر برین واشنگ(Brain washing) کر کے انہیں خودکش حملوں کے لیے تیار کرتا ہے۔ایک مولوی جو اپنی دولت خودکش حملہ آوروں کو تیار کرنے کے لیے لگاتا ہے۔ تیسرا کردار اللہ بخش کا ہے جو لوگوں کو درس و نصیحت کرتا ہے اور ان کو ٹریپ کر کے حملے کرواتا ہے۔یہ تینوں کردار دتّا کی پولیس کے پاس حاضری اور بیانات قلمبند کروانے کے بعد گرفتار ہوتے ہیں اور اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔

دہشت گردی کے موضوع پر لکھا جانے والا قسط وار ڈرامہ تھا۔ مگر اس کے تمام مردانہ کرداروں کے دماغ ایک دوسرے کے حکم کے تابع نظر آتے ہیں۔ سب کی اپنی سوچ یا خیال ہے۔ خائستہ گل اور دوسرے افراد ملک دشمن عناصر کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ مولوی، دتّا، سرفراز اور اللہ بخش کے کردار ایک دوسرے کے حکم کے تابع و غلام ہیں۔ ان کی اپنی کوئی سوچ نہیں ہے۔ وہ صرف کٹھ پتلیاں ہیں، جیسا انہیں سبق دیا جاتا ہے، ویسا سبق سناتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ یہ ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ جو ان کی دنیا اور آخرت دونوں کو تباہ کر رہا ہے۔ ذیلی کرداروں کے نفسیاتی تجزیے سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت خود ساختہ نہیں بلکہ ان کی نفسیات کو جس سانچے میں ڈھالا گیا ہے، اسی سانچے میں ڈھل گئی ہے۔ ان کا نفس، انکی عقل اور ان کی سوچ کسی اور کے تابع ہے۔

خائستہ گل جو بہت عرصے تک افغانستان میں رہائش پذیر رہا۔ وہاں پر دہشت گردی کے پروپیگنڈے میں شامل رہا اور وہیں سے جب وہ پاکستان لوٹا تو ملک دشمن بن کر۔ اس کے نزدیک دشمن ملک کے باشندے ملک کے حکمران ہیں، جبکہ وہ ناسمجھ یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ جہاں سے وہ لوٹا ہے یا جس نے اس کو یہ ترغیب دے کر بھیجا ہے وہی ملک کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس کے نزدیک ملک کے دشمن وہی ہے جو ملک کا نظام بناتے ہیں۔ اس لیے اس نے اپنا ایک نظام ترتیب دیا خائستہ گل کا کردار ہمیں بتاتا ہے، کہ کس طرح سے کسی انسان کی سوچ اور فعل درجہ بدرجہ کسی کے تابع ہوتا چلا جاتا ہے۔

ڈرامہ "تم ہو کہ چپ" میں مرد کرداروں کی نفسیات بھی توجہ طلب ہے۔ سردار جمال خان انانیت، حاکمیت میں ڈوبا ایک ایسا مرکزی کردار ہے۔ جو ڈرامے میں شروع سے آخر تک چھایا ہوا ہے۔ اس کی سوچ اس

کے فعل کی عکاسی کرتی ہے۔ کردار کا حلیہ وضع قطع اس کے مطلق العنان بادشاہ کے روپ کو پیش کرتی ہیں۔ سردار جمال خان قبیلے کا ظالم اور جابر سردار ہے۔ جس کی حاکمیت کا اکّا پورے قبیلے میں چلتا ہے۔ ماضی میں بہت سے ڈراموں میں ایسے کردار ملتے ہیں۔ جو ظلم و جبر کے باعث قاری اور ناظر کے ذہن پر نقش ہوتے چلے گئے۔ سردار جمال خان کا کردار بھی ایسا ہی کردار ہے۔

قبائلی نظام بادشاہی نظام کی ہی ایک شکل ہے جس میں جمہوری نظام کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ ہر قبیلے کا اپنا سردار ہوتا ہے جو ہر طرح سے خود مختار ہوتا ہے اور کسی بھی طرح کا حکم سنانے میں حق بجانب ہوتا ہے ۔ وہ کسی کو جواب دہ نہیں ہوتا۔ قبائلی علاقوں میں بیٹا باپ کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی ڈگریاں لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ کیوں نہ بن جائے۔ سردار سرداری کو کسی طور جھکنے نہیں دیتا۔ اس ڈرامے میں بھی بتایا گیا ہے کہ سردار پگڑی پہننے کے بعد ہمیشہ اپنے رعب و دبدبے کو اونچا رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کی تعلیم اس کی سرداری میں کسی قسم کی رکاوٹ کھڑی نہیں کرتی ہے۔ وہ ایک ایسا کردار ہے جو اپنی سوچ میں آزاد ہے۔ وہ ایک ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لیے دہکتے کوئلوں پر چڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کا کردار ایک ایسے جذباتی انسان کا کردار ہے، جو اپنی عزت کی خاطر جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے۔ سردار جمال خان کے آگے کسی کو بولنے کی ہمت نہیں ہے۔ مگر جب اس کی اپنی بہو اس کے آگے بولتی ہے تو وہ یوں برہمی کا اظہار کرتا ہے۔

> ”سردار جمال خان: خدا کا قسم کیسا بات اس نے ہمارے منہ پر مارا ہے اگر ہماری تینوں بیویوں میں سے ایک بھی ہمارے ساتھ ایسے بات کرتا، تو ہم اس کو زندہ درگور کر دیتا ،بس اب اس کو اور معاف نہیں کرے گا۔“(۲۱)

جو شخص گھریلو مسائل اور الجھنوں کا شکار ہوتا ہے اس کی حرکات و عادت میں عام نفسیاتی امراض ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ جیسے:

ڈپریشن (Depression)

احساسِ کمتری (Sense of Inferiority)

غصہ (Anger)

خوف و گھبراہٹ (Fear and Anxiety)

خودکشی کا رجحان (Suicide Attempt)

ایسے ہی نفسیاتی مسائل ہمیں منتخب ڈراموں کے کرداروں میں بھی نظر آتے ہیں۔ سردار جمال خان اپنی بات پر ڈٹ جانے والا سردار ہے۔ جو اپنے بیٹے کی نرم دلی پر بھی غصے کا اظہار کرتا ہے اور اس کو سخت دل ہونے کی تلقین کرتا ہے صرف اس لیے تاکہ کوئی اس کے آگے نہ بول سکے۔ سردار جمال خان ایک پست ذہن کا انسان ہے جو اپنی بہن کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھتا ہے۔ اس کی نفسیات اس وقت واضح ہوتی ہے جب وہ تیسری شادی اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے کرتا ہے اور اس کی دونوں بیویاں اس کی تیسری دلہن کو اپنے ہاتھوں سے سجاتی ہیں۔ میر ضرار باپ کو چھوٹی لڑکی سے شادی پر روکتا ہے تو سردار کے یہ الفاظ اس کی پست ذہنیت کو ہمارے سامنے لے کر آتے ہیں۔ ”سردار جمال خان: اب کیا کرے ہمارا اس پہ دل آگیا ہے۔“

چاہے سردار جمال خان کا کردار ہو یا سردار میر ضرار کا دونوں نے اپنی پگڑی کی بقا کو قائم و دائم رکھنے کے لیے معصوم لوگوں کی زندگیوں کو تختہ دار پر لٹکایا ہے۔ اس ڈرامے میں میر ضرار اور سردار جمال خان کا کردار پورے ڈرامے پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ ان دو کرداروں کی نفسیات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو دونوں کی نفسیات ملتی جلتی ہیں۔ نڈر، بہادر، جانباز اور پختہ ارادوں والے باپ اور بیٹے کے کردار میں زیادہ فرق موجود نہیں ہے۔

سردار جمال خان نے بی بی جانم جو اس کی جامعہ کی ہی طالبہ تھی، سے عشق کیا اور میر ضرار نے بھی ایسے ہی ایک لڑکی سے فریبی عشق کیا۔ ان کرداروں پر بات کرتے ہوئے ہماری سوچ میں تاریخی کردار بھی ابھرتے ہیں ۔ ”آغا حشر کاشمیری“ کا ڈرامہ رستم و سہراب جو کہ باپ اور بیٹے کی کہانی ہے۔ بیٹا باپ کا مشابہ ہے۔ رستم کی عادات سہراب میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس ڈرامے میں بھی بیٹا باپ کی طرح ہے۔ باپ کی طرح بیٹا بھی شادیاں کرتا ہے اور نئی بیوی کے آنے پر پرانی کو فراموش کر دیتا ہے۔ اس کی سوچ بھی باپ کی طرح ہے کہ لڑکی کو جوتے کی نوک پر رکھو۔ ان کرداروں نے اپنے افعال سے ہمیں اپنی سوچ اور پست ذہنیت کے بارے میں بتایا ہے۔ بقول نفسیات دان:

"بچے جب سماجی قدروں اور عقیدوں کو اپناتے ہیں تو والدین اور کنبے کے دوسرے

افراد کے رویے بھی ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ والدین کا رویے آمرانہ ہو تو اس کا براہِ راست اثر بچوں پر پڑتا ہے۔ سماجی آموزش اور سماج کے تئیں ان کے رویے اس سے بڑی حد تک متاثر ہوتے ہیں۔"(۲۲)

اسی طرح سے میر ضرار پر بھی اس کے باپ اور اس کی حویلی کے ماحول نے جتنا گہرا اثر ڈالا، اتنا گہرا اثر اس کی ڈگریاں اور اس کی تعلیم نہ ڈال سکی۔ مرکزی کردار ڈرامے کی جان ہوتا ہے۔ اسی سے ڈرامے میں تجسس اور ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ مرکزی کردار اعلیٰ عادات و اخلاق کا پروردہ نہیں بلکہ اس میں بہت سی برائیاں پائی جاتی ہیں۔ جس کے باعث یہ ڈرامے کا ولن زیادہ لگتا ہے۔ اس کے اندر رومانوی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس کا صنفِ مخالف سے بات کرنے کا انداز ہمیں بتاتا ہے، کہ یہ ایک رومانوی کردار ہے میر ضرار جب مشل سے بات کرتا ہے تو اس کے انداز رومانوی عناصر لیے ہوئے سامنے آتے ہیں۔

میر ضرار:

"have you ever been to Texas"

وہاں کی لڑکیاں ایسی ہوتی ہےtall and tough۔"(۲۳)

میر ضرار رومانی طبیعت کا شخص ہے۔ جو باتوں سے دوسروں کے دلوں پر قابض ہوتا ہے۔ وہ مشل سے یوں اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔

"اُدھر گھر پتھر کے ہوتے ہیں، مگر ایک گھر ایسا ہے جو پتھر کا نہیں ہے وہ میرے دل کا گھر ہے مگر اس میں کوئی سپیشل رہتا ہے۔"(۲۴)

میر ضرار ایک اور جگہ یوں رومانویت کا لبادہ اوڑھے ہمیں نظر آتا ہے۔"

"تم جانتی ہو میں تم سے محبت کرتا ہوں تم جانتی ہو ہم مٹی میں رہنے والے لوگ ایس ایم ایس کی محبت پر یقین نہیں کر سکتے۔ ہم تو عشق کی جڑوں کو ہمیشہ زمین میں رکھتے ہیں تاکہ وہ ہمیشہ ہری رہیں۔"(۲۵)

یہ ایک رومانوی کردار ہے مگر جب بات اس کی ذات، حویلی اور خاندان کی آتی ہے تو وہ پیار، عشق محبت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی عزت بچاتا ہے۔ ضرار کی بیوی مشل جب اس کی قید سے فرار ہونے کی کوشش

کرتی ہے تو وہ اپنی محبوب بیوی کو قتل کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ مشل اس کے سامنے روتی بلکتی بھوکی پیاسی رہتی ہے مگر میر ضرار پر اس کے کسی عمل کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ اس کو پرواہوتی ہے تو صرف اپنے ہونے والے بچے کی۔ میر ضرار اپنے باپ کے رنگ ڈھنگ میں ڈھلا ہوا ہے۔ مگر اس کے اندر کبھی کبھی سرکشی کا پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے۔ جب اس کا باپ دشمن کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اپنے باپ کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر باپ کا جلال و دبدبہ اس کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ ہیرو نما ولن کا کردار اس وقت اپنے انجام کو پہنچتا ہے جب اس کی بیوی بھاگنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ سردار جمال خان اپنی بیوی کو مشل کے بھاگنے میں مدد کرنے کی پاداش میں زندہ درگور کرنے کا حکم دیتا ہے۔

یہ المیہ کہانی اپنے انجام کو بڑے ٹریجک انداز میں پہنچتی ہے۔ جب میر یہ دکھ سہہ نہیں پاتا اور تنہا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سردار جمال خان کے دشمن اس کو مار دیتے ہیں۔ سردار جمال خان درندہ صفت قبیلے کا کردار اپنے ہر عمل سے اپنی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے اور کہانی میں پورے طمطراق سے براجمان ہے۔ اس کا حلیہ قبائلی سرداروں جیسا ہی ہے۔ اپنے قول و فعل کا پکا ضدی اور اکھڑ مزاج انسان ہے۔ یہ وہ ولّن ہے جو دو پیار کرنے والوں کو جدا کرتا ہے، غریبوں پر ظلم کرتا ہے اور بے قصوروں کو موت کی نیند سلاتا ہے۔ اس کی نظر میں اس کا ہر عمل اور اس کی کہی ہوئی بات حرفِ آخر ہے اس نے اپنی بہن کو قید کیا ہوا ہے، اور اسی قید میں اس کی بہن پاگل ہو جاتی ہے اس کا یہ عمل ظلم و بربریت کی الگ ہی کہانی سناتا ہے۔

اس کردار کے ذریعے ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ برائی تا قیامت نہیں رہے گی۔ اس نے ایک دن ختم ہو ہی جانا ہے۔ جب دنیا میں گناہوں کا بوجھ زیادہ ہونے لگے تو لوگ عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔ سردار جمال خان اپنی بیوی کو ملزم گردانتے ہوئے اس کو زندہ درگور کر دیتا ہے۔ اس کی نظر میں اس کی بیوی نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ لیکن اکلوتے بیٹے کی موت اس کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ اسی غم میں سردار جمال خان اپاہج ہو جاتا ہے اور وہ باقی ساری زندگی معذوری کی حالت میں گزار دیتا ہے۔ یہ کردار نفسیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو ظالم، جابر اور ابنارمل کردار ہے۔ جو کسی بھی طرح سے ایک نارمل انسانی کردار سے مختلف ہے۔

"بول میری مچھلی" میں مردانہ کرداروں کے حوالے سے دو کردار زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ مرد کردار اپنی اہمیت نہیں رکھتے۔ مگر دو کردار اس کہانی کو دلچسپ بناتے ہیں۔ ان میں پروفیسر

وحید کا کردار خاصا دلچسپ کردار ہے جو شروع سے آخر تک پورے ڈرامے میں موجود ہے۔

ڈراما خاصا طویل ہے۔ اگر پروفیسر وحید کا ذکر کیا جائے تو یہ ایک سادہ لوح متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا مرد ہے۔ اپنے اہل خانہ کا واحد کفیل ہے۔ وہ سفید پوشی اور پر سکون زندگی گزار رہا ہے مگر اس نے اپنی بیٹیوں کو آزادی دے رکھی ہے۔ ان پر بے جا پابندیاں نہیں لگائیں مگر بچیوں کو ان کی حد ضرور بتا دی ہے ۔بیٹیاں باپ کی عزت کا پاس رکھتے ہوئے گھر سے باحجاب نکلتی ہیں مگر محلے کی گلیوں سے اوجھل ہوتے ہی حجاب اتار دیتی ہیں۔ وہ ایک مخصوص طبقے سے پردہ کرتی ہیں۔ پروفیسر وحید اس بات سے بے خبر رہتا ہے۔ بیٹے کی نہ پوری ہونے والی خواہش کو دل میں دفنائے اپنی بیٹیوں کو ہی بیٹا اور اپنا فخر مان لیتا ہے۔ پروفیسر یہ نہیں سوچتا کہ بیٹی کو بیٹا کہنے سے وہ بیٹا نہیں بن جائیں گی اور بیٹیاں ہی رہیں گی۔

پروفیسر وحید کی نفسیات ایک عام انسان کی نفسیات ہے۔ زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے اور بیٹیوں کو ہر طرح کی آزادی دیتے ہوئے وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ بیٹیوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت بھی بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر صاحب نااہل ثابت ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر وحید کم گو ،سادہ مزاج حالات کا مارا ہوا مگر اپنے اہل خانہ پر اندھا اعتماد کرنے والا مرد ہے۔ معمر افراد کے بارے میں نفسیات دان کہتے ہیں کہ:

> "فرد سست رفتار ہو جاتا ہے اور اس کے اندر احساس کمتری پیدا ہونے لگتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وقت اس کے ہاتھوں سے پھسل رہا ہے۔ عموماً چالیس برس کی عمر پار کرتے کرتے عمر بڑھنے کا احساس ستانے لگتا ہے۔ زیادہ عمر بڑھنے پر موت کے نزدیک آنے اور جانے کا احساس زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔ یہ سارا ڈران عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جن میں صحت، مالی حالت ،معاشرہ، نفسیاتی کیفیت کنبہ اور فلسفیانہ مذہبی خیالات شامل ہوتے ہیں۔"(۲۶)

اس کی زندگی میں حالات اس وقت انتہائی خطرناک صورت اختیار کر جاتے ہیں جب اس پر آشکار ہوتا ہے کہ اس کی بیٹیاں غلط راہ پر نکل پڑی ہیں۔ اس کی اپنی ہی بیٹی اس کو رسوا کر دیتی ہے۔ اس نے اپنی بیٹیوں کو بے جا آزادی تو دی مگر ان کو صحیح غلط کی پہچان نہیں کروائی۔ پروفیسر وحید کہتا ہے کہ

"مجھے پتہ نہیں تھا کہ میرے گھر کے باہر کی زندگی یکسر بدل چکی ہے اور اب نئی حقیقتوں کو ماننا پڑے گا۔"(۲۷)

جب پروفیسر کو علم ہوتا ہے کہ اس کی بیٹیوں نے اس کی عزت کو نیلام کر دیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔ اس کو دوسرا جھٹکا اس وقت لگتا ہے جب اس کی تیسری بیٹی نوری پر محلے کے لوگ کیچڑ اچھالتے ہیں۔ نوری غصے میں گھر چھوڑنے کی بات کرتی ہے وہ جوان بیٹی کا گھر چھوڑنا برداشت نہیں کر پاتا اور اس کو ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔

پروفیسر وحید اس وقت یہ الفاظ بولتا ہے کہ "انہوں نے میرے دل کو چیر کے دیکھا ہے وہ نہیں جانتے کہ کتنا مضبوط تھا جو اب نہیں رہا۔"(۲۸)

پروفیسر صدیقی کی نفسیات ایک عام مرد کی نفسیات ہے جو اپنے گھر بار پر اندھا اعتماد کرتا ہے۔ جس کے نزدیک ضروریات زندگی کھانا، روٹی، پانی اور لباس مہیا کرنا ہی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ بیٹیاں جو اپنی خواہشوں کو دفنائے ہوئے اپنا بچپن اور اپنی جوانی گزار رہی تھیں، انہوں نے اپنی خواہشات پورا کرنے کے لیے غلط راہ چن لی ہے۔

مجاز صدیقی کی کا کردار ایک ایسے مرد کا کردار ہے جو باتوں میں طاق ہے۔ اپنی باتوں سے دنیا والوں کے دل جیت لیتا ہے۔ شاعر حضرات عموماً رومانوی طبیعت کے حامل ہوتے ہیں، رومانوی باتیں ان کی شاعری کا ایک اہم جز ہوتی ہیں۔ وہ اپنی رومانوی باتوں کو نثر سے شعر میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان کی زبان میں ایک خاص قسم کی حلاوت مٹھاس اور شیرینی ہوتی ہے۔ جس سے وہ سب کو گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ مجاز صدیقی اپنے آپ کو دوسروں سے منفرد سمجھتا ہے۔ وہ خوبصورتی کا دلدادہ ہوتا ہے۔ حسن کے ارد گرد پروانے کی طرح منڈلانے والا اور موقع ملنے پر اس حسن کی شمع کو نقصان پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اس کی بیوی اس کا کردار اس انداز میں واضح کرتی ہے۔

"میں نے اسے چھوڑا ہے! وہ ایک بہت گھنّا آدمی ہے۔ بہت خوبصورت باتیں کرتا ہے۔ اس میں ایک ایسی کشش ہے کہ لڑکیاں چاہے جیسی بھی ہوں ایک بار مڑ کر دیکھتی ضرور ہیں۔ بس پھر اس کا کام شروع ہو جاتا ہے، اور وہ پھر ان کو اپنے جال میں پھانس لیتا

ہے۔"(۲۹)

اس کی نفسیات ایک شاطر مرد جیسی ہے۔جو اپنی ظاہر کے اعتبار سے سلجھا ہوا مرد ہے۔ مگر اس کی نظریں مکاری کی چمک لیے ہوئے ہیں۔ اپنی شاطرانہ چالوں کے باعث زندگی کے ہر موڑ پر اپنا مفاد حاصل کرنا جانتا ہے اور وہ اس طریقے سے کھیل کھیلتا ہے کہ اس کی ذات گندگی میں لتھڑی ہوئی ہونے کے باوجود پاک صاف دکھائی دیتی ہے۔ مجاز نے کئی معصوم لڑکیوں کی زندگی برباد کی مگر خود کو معصوم ظاہر کر کے پاک صاف بنا رہا۔ وہ ایک ایسا مرد ہے جو لڑکیوں کو اپنی باتوں کے جال میں پھنسالیتا ہے۔ مجاز نے اپنی بیوی کو تو چھوڑ دیا ہے ۔ مگر دو بہنوں پر نظر رکھ لیتا ہے۔ رباب جو کہ اس کے رسالے میں کہانیاں لکھتی تھی۔اس کے پاس اپنی بہن کے ساتھ آتی ہے، دونوں جڑواں بہنیں ہیں۔ دونوں ہی اس کی باتوں میں آجاتی ہیں۔پہلے وہ رباب کے ساتھ ناجائز تعلق بناتا ہے۔جب وہ پیچیدگی کے باعث مر جاتی ہے۔تو سحاب کو اپنی باتوں میں لے کر شادی کر لیتا ہے ۔اس کے یہ رومانوی جملے اس کی رومانوی طبیعت کو ظاہر کرتے ہیں۔

"وہ کہتے ہیں نہ کہ۔۔۔۔۔مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا؛اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا، ہم تو آپ کو صاحب جی ہی کہیں گے۔اگر آپ کے اندر محبت کے کئی رنگ ایک ساتھ blossom کرتے ہیں تو۔"(۳۰)

مجاز صدیقی ایک اور جگہ رباب کو اپنے جال میں پھنساتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ

"ایک دن میں نہیں ہوا یہ سب کچھ پتہ نہیں کب سے تمہاری کہانیاں میرے اندر قطرہ قطرہ سناتی رہی ہیں۔ تمہاری مجھ سے محبت ایک ہوا کے جھونکے کی طرح آئی ہے یہ ٹھہرے گی یا نہیں میں نہیں جانتا مگر یہ تو میرے اندر پھیلتا ایک موسم بن گیا ہے۔"(۳۱)

مجاز رباب کو تو مار دیتا ہے۔ مگر سحاب سے محبت بڑھالیتا ہے۔ اپنے گناہوں پر شرمندہ نہیں ہوتا بلکہ فخر سے اپنے ارادوں پر قائم رہتا ہے۔ اس کی نفسیات ایک عام شریف مرد کی نہیں بلکہ بدکردار مرد کی ہے جو لڑکیوں کو اپنے ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کو اپنی شہرت اپنی بیٹی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔وہ اپنی معصوم بیٹی کو بھی اپنے پاس رکھنے سے گریز کرتا ہے۔اپنا نام بچانے کے لیے اپنی پہلی بیوی کو ایک خطیر رقم پیش کر دیتا ہے۔ اسی باعث اس کی بیوی اس سے بدلہ لینے کے لیے مقدمہ دوبارہ دائر کر دیتی ہے۔ مجاز کا کردار امیر شخص کا

کردار ہے جو پیسے سے سب کچھ خرید سکتا ہے۔ اس کی نفسیات بگڑے ہوئے مرد کی ہے۔ جسے کھیلنے کے لیے کھلونا صرف اس وقت تک چاہیے جب تک اس کی خواہش ہو گی۔ اگر خواہش ختم ہو گئی تو وہ اس کو توڑ مروڑ کر رکھ دے گا۔ مجاز نے اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے پیسوں کا سہارا لیا ہے اور پیسوں کے ساتھ سب کچھ خرید لیتا ہے۔

ڈراما **"دل تو بھٹکے گا" کے** مرد کردار نہایت جاندار ہیں۔ ان مردانہ کرداروں کے ذریعے بھی ہمیں جاگیر دارانہ سوچ دکھائی دیتی ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے حکمرانی کرنے والے حاکم دکھائی دیتے ہیں۔ ان کرداروں کے باعث حویلی میں رہنے والے مرد جو بااثر ہیں ان کی سوچ کا پتہ چلتا ہے۔ باپ کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو خاندان کا سربراہ ہوتا ہے مگر اولاد کو اچھے برے کی تمیز سکھاتا ہے۔ اس ڈرامے میں باپ خاندان کا سربراہ تو ہے۔ مگر اولاد کو صحیح غلط کی پہچان نہ کروا سکا اس نے اپنی اولاد کو صحیح غلط کی پہچان نہ بتائی مگر ان کو دولت خرچ کرنے کی طرف راغب کرتا رہا۔ اپنے سب بیٹوں کو تعلیم تو دلوادی کہ مگر بڑے بیٹے کو گناہوں سے نہ روک سکا۔ وہ آئے دن گناہ کرتا تھا مگر باپ کو صرف اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں اس کے برے اعمال کی کسی کو خبر نہ ہو جائے اور ہماری عزت نہ خراب ہو جائے۔ وہ بیٹے غلط راستے پر چلنے سے روک نہ سکا۔ اس کے اندر دولت کی لالچ تھی اور اس کے بیٹوں کو بھی یہ لالچ وراثت میں ملی۔ باپ کا کردار حاکم اعلیٰ کا کردار ہے۔ اس میں ناصحانہ عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے حاکمانہ رویے کو ہمارے سامنے لایا گیا ہے۔ ٹھاکر اپنے مکالمہ کے باعث اپنی سوچ کو واضح کرتا ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ شادی ایک عام چیز ہے۔ جس کو کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ اپنے بیٹے کو اپنی بڑی بہو سے شادی کرنے پر اس لیے راضی کرتا ہے کہ وہ تمہارے پیر کی زنجیر نہیں ہو گی۔ ٹھاکر بیٹے سے کہتا ہے کہ "تو یاسمین کو پیر کی زنجیر کیوں سمجھتا ہے وہ تو یہاں رہے گی ہمارے پاس تو شہر میں جو مرضی کریں۔"(۳۲)

یہ وہ الفاظ ہیں جس سے ٹھاکر کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ٹھاکر مرد کے جرم کو تو قابلِ قبول سمجھتا ہے مگر عورت کے جرم کو معاف نہیں کرتا اس کے ڈائیلاگ اس کی سوچ کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ یوں کہتا ہے کہ:

"صدیوں میں ایسا نہیں ہوا ہے ہاں یہ ہوا ہے کہ کسی لڑکی نے نوکرانی کے ماں بننے کی

خبر دی ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہوا ہے۔"(۳۳)

اس کے نزدیک عورت کا جرم، جرم ہے جبکہ مرد کا جرم کوئی جرم نہیں۔ مرد گناہ کر کے بھی پاک اور صاف ہے جبکہ عورت گناہ اور غلطی کرے تو اس کو سزا دی جائے گی۔ وہ اپنی بہو کو زندہ در گور کرنے کی سزا سناتا ہے۔ اس سے پہلے اس کو پتھروں سے سنگسار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس مکالمے کے باعث ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ٹھاکر ایک جابر ظالم حکمران ثابت ہوا ہے۔ جس نے حویلی کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا ہے لیکن اس کا اپنا ہی بیٹا جو شہر میں رہتا ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اس کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

بلاول نفسیاتی عارضے میں مبتلا ایک ایسا کردار ہے جو بلّا کامے نوش ہے۔ اس کو اپنی بیوی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کردار کے ذریعے مصنف اس گرہ کو کھولتا ہے، جو شرابیوں کے حوالے سے اس کے ذہن میں موجود ہے۔ بلاول ٹھاکر کا بڑا بیٹا ہے، جو ہر طرح کے گناہ کا مرتکب ہے۔ وہ شراب نوشی، عیش پرستی اور ہر غلط کام کرتا ہے۔ یہ کردار کہانی کے شروع کے حصے میں موجود رہتا ہے پھر سڑک حادثے میں جان بحق ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے شخص کا کردار ہے جو کسی جائز رشتے کو اہمیت نہیں دیتا۔ اس کی بیوی پانچ سال تک اس کے سدھرنے کا انتظار کرتی ہے مگر وہ پھر بھی راہِ راست پر نہیں آتا۔ اس کے کردار میں ہر برائی موجود ہے۔ اسے سکون گھر کے پاک ماحول کے بجائے رقص و سرور کی محافل میں ملتا ہے۔ وہ اپنی ہر رات ایسے ہی گزارتا ہے۔ اس کو بظاہر کوئی مرض نہیں مگر اس کا باطن اور اس کی روح بیمار ہے۔ وہ شراب نوشی اور نشے کی عادتوں میں مبتلا ہے۔ نفسیات دان کا کہنا ہے کہ:

> "کرداری نظریہ جو آموزش پر زور دیتا ہے فرض کرتا ہے کہ لوگ شراب اور دوسری نشہ آور دوائیاں استعمال کرنا سیکھ لیتے ہیں ان منشیات سے جو کیف سرور ملتا ہے وہ آموزش کا سبب بنتا ہے اور اس کو تقویت پہنچاتا ہے۔"(۳۴)

وہ اپنے مرض کو چاہ کر بھی ٹھیک نہیں کر سکتا ۔ اس کردار میں ہمیں کوئی اچھائی نظر نہیں آتی ہے۔ اس کے نزدیک اس کی بیوی ایک عام شے ہے جو حویلی میں موجود ہے۔ وہ اپنے کسی بھی رشتے کو اہمیت نہیں دیتا ہے۔ یہ ایک ایسے مرد کا کردار ہے۔ جس کے نزدیک اس کی خواہشات اور اس کی ضروریات ہی معنی

رکھتی ہیں اور اپنی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہ ہر غلط راہ اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے مرنے سے کہانی ایک نیا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ وہ ایک ایسا شوقین مزاج انسان ہے، جس کے نزدیک زندگی رقص و سرور کی رنگین محفلوں تک محدود ہے۔ اس نے اپنی زندگی کو ایک مخصوص دائرے میں قید کر رکھا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو اپنی دیورانی جیسا بننے پر مجبور کرتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ "یہی تو میں تمہیں کہتا ہوں کہ تم حسن بانو کی طرح بن کر رہو۔"(۳۵)

مگر یاسمین ویسے نہ بن سکی اور اپنی اور اس کی زندگی کو بے رنگ کر دیتی ہے۔

بقول:

> "جب ہم غیر صحت مند ذہن کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ ایک شخص کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہے خواہ اس کی نوعیت معمولی ہو یا سنگین اگر کسی شخص کا ذہن صحت مند نہیں ہے تو سماج دشمن کردار کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے اس کے علاوہ منشیات کا عادی ہو سکتا اور عورتوں پر جنسی، جنسی ہو سکتا ہے جنسی بے راہ روی یا کجروی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ وہ دوسروں کو ایذا پہنچا کر خوش ہو سکتا۔"(۳۶)

سجاول ایک ایسے انسان کا کردار ہے۔ جو شادی کے بعد اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کرتا اور اس کے ساتھ خوش رہتا ہے۔ اس میں غصہ اور انّا موجود ہے۔ وہ غیرت کے نام پر قتل کرنے کو ترجیح دیتا ہے مگر وہ بیوی کی میٹھی باتوں میں آ کر گھر والوں کے خلاف ہو جاتا ہے۔ اور اس کی بات مانتے ہوئے جائیداد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک جذباتی انسان ہے۔ جو اس کے باپ کے غصے کو اور بڑھاوا دیتا ہے اسی کے باعث اس کا باپ اس پر گولی چلا دیتا ہے۔ الغرض اس میں جذباتی پن موجود ہے۔

شمائل کا کردار اس ڈرامے میں سب سے اہم ہے۔ اس کردار کے ذریعے کہانی بام عروج پر پہنچتی ہے۔ شمائل نے حویلی میں پرورش پائی مگر اس ماحول کو اپنے اوپر حاوی نہیں کیا۔ شہر جا کر تعلیم حاصل کی۔ اپنی پُر سحر شخصیت کے باعث شمائل جامعہ میں ہر دلعزیز رہا۔ اس کردار میں جاگیر دارانہ طور اطوار نہیں ہیں۔ یہ خوبی اس کے کردار کو اہم بناتی ہے۔ وہ غلط کام کرنے پر بھی سزا کو حق بجانب نہیں مانتا۔ وہ اپنی بھابھی کی پہلی اور آخری غلطی بھی اسی لیے معاف کر دیتا ہے۔ اس کردار کے باعث ہی "یاسمین" مرکزی کردار کی جان بخشی ہوتی ہے

۔ یہ کردار سچ کا ساتھ دینے والا کردار ہے۔ جو اپنوں کی غلطیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ اس کے نزدیک عورت کی عزت سب سے مقدم ہے وہ اپنے باپ کو کہتا ہے کہ "بابا جانی مردانگی عورت کو دبا کر رکھنے میں نہیں ہے بلکہ عورت کو آزاد کرنے میں ہے۔"[۳۷] ایک اور جگہ وہ اپنی سوچ کو یوں آشکار کرتا ہے کہ "میں ہمت کروں گا کہ آپ کے کیے گناہ کا بوجھ اٹھا سکوں۔"[۳۸]

شمائل ایک حوصلہ مند اور باکردار انسان کا کردار ہے۔ اس کے نزدیک عورت کی عزت سب سے بڑھ کر ہے۔ وہ نیکی کرنے کے لیے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تک تیاگ دیتا ہے۔ اس نے اپنی تعلیم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ حویلی کے جاگیر دارانہ رویے کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ بغاوت کرتا ہے اور اپنے باپ کے خلاف ہو جاتا ہے۔ جب اس کا باپ اپنی بڑی بہو کو غلط کام کرنے پر سنگسار کرنے پر بضد ہو جاتا ہے تو وہ اپنی بھابی کو لے کر حویلی سے نکل جاتا ہے۔ یہاں ہمیں شمائل ایک ایسا منفرد انسان نظر آتا ہ۔ جو سزا سے پہلے معاف کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ ایک اور جگہ شمائل بحث کرتے ہوئے اپنی سوچ کو واضح کرتا ہے کہ:

> "اس لیے امّی جان مارنے سے بچانے والا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ خاندان کی عزت گھر کی عورتوں کو مارنے میں نہیں ہوتی ،بلکہ عورتوں کے عیبوں پر پردہ ڈالنے میں ہوتی ہے۔"[۳۹]

شمائل اپنی بھابی کے کیے گئے گناہ پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ غلطی ہے، گناہ نہیں۔ وہ بھابھی کو بچانے کے لیے گھر والوں سے لڑ جاتا ہے۔

اس ڈرامے کے کرداروں میں جاگیر دارانہ رویہ نظر آتا ہے۔ اسی لیے مرد کردار اپنی سوچ اور عمل کے باعث توجہ طلب کردار بن جاتے ہیں۔ ہمیں ان کرداروں میں برائی اور اچھائی کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اس ڈرامے میں ڈراما نگار نے جذبات کی پیشکش بہت عمدگی سے کی ہے۔ ڈراما نگار نے جاگیر دارانہ نظام کو اپنے فکر و فن کا محور بنایا اور جذباتی عناصر کی فراوانی کے ساتھ اس ڈرامے کے ذریعے اس نظام کی پیچیدگیاں بھی بیان کی ہیں۔

د۔ خواتین کرداروں کا نفسیات کے تناظر میں مطالعہ:

نسوانی کردار کسی بھی کہانی کی جان ہوا کرتے ہیں۔ انہی کرداروں کے باعث کہانی زیادہ دلچسپ اور عمدہ طریقے سے پیش کی جاتی ہے۔ مرد اور عورت زندگی کے دو پہیے ہیں۔ ان میں سے ایک کے بغیر بھی کہانی نامکمل ہوتی ہے۔ اگر ایک بھی موجود نہ ہو تو زندگی رک جائے گی۔ نسوانیت، تانیثیت، تانیثfeminism چاہے جس بھی شکل میں ہو اہمیت کی حامل ہے۔ یہ زندگی کے سٹیج پر الگ الگ کردار ادا کرتی اور مختلف روپ دھار لیتی ہے۔ زندگی کے ایسے شعبے جہاں عورت کا وجود ہی معیوب سمجھا جاتا ہے وہاں بھی اب عورت خاصی اہمیت کی حامل اور توجہ طلب نظر آتی ہے۔

جدید معاشرے نے عورت کے وجود اور مرتبے کو بدلا، وہیں آدم نے بھی اس وجود و مرتبے کی تبدیلی کو قبول کرتے ہوئے عورت کو خاص انداز میں پیش کیا ہے۔ ادب اس وجود کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا ہے۔ مرد و عورت کا استحصال ہر معاشرے میں ہوتا رہا ہے۔ آج کے ڈرامائی ادب میں جو عورت ہمیں دکھائی دیتی ہے، وہ دورِ قدیم کی عورت سے یکسر مختلف ہے۔ زندگی کے ہر دور میں اس کی الگ الگ نفسیات ہوتی ہے۔ اس نفسیات کی ہی بدولت وہ اپنا اچھا یا برا کردار ادا کرتی ہے۔

> "انسانی کردار ایک پیچیدہ مظہر ہے اس لیے اس کو سمجھنا بھی اسی قدر پیچیدہ ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ دوسروں کو مکمل طور پر سمجھ رہا ہے تو یقیناً اس کی غلط فہمی ہو گی۔ دوسروں کے جو فعل و عمل یا کرداری رجحان ہمیں دکھائی دیتے ہیں وہ اکثر و بیشتر سطحی ہوتے ہیں ان کے ذریعہ ہمیں دھوکا ہو سکتا ہے بلکہ اکثر و بیشتر صورتوں میں ہوتا ہے۔ کردار کو ہم سمندر میں بہتی برف کی چٹان ice berg سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ اس طرح کی چٹانوں کا محض آٹھواں حصہ سطح سمندر پر نظر آتا ہے بقیہ پانی کے اندر ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح کا بیشتر حصہ ہوتا ہے۔ لاشعور میں پڑی ہوئی نامکمل خواہشات اپنے بالواسطہ یا بلاواسطہ اظہار کے لیے کلبلاتی رہتی ہیں۔"(۴۰)

کرداروں میں نفسیات کا تجزیہ نہایت ضروری ہوتا ہے۔ ان ڈراموں میں عورت کی نفسیات عملی

کردار کے ذریعے پیش کی گئی ہیں۔ ان کرداروں کی نفسیات دلچسپ اور توجہ طلب ہے۔ عورت ہر روپ میں الگ الگ سوچ اور نفسیات رکھتی ہے۔ لفظ نفسیات کے مطالعے سے ہمیں کردار کے حرکات افعال کی وجوہات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اصغر ندیم سیّد عورت کی نفسیات کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور وہ اس کو الگ الگ انداز میں پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔

عورت کی نفسیات کو پرکھنے کے لیے اس کے افعال اور کردار کا پتہ لگانا بہت ضروری ہے وہ کوئی کام کیوں کر انجام دیتی ہے۔ اس کی ذات کے چھپے ہوئے گوشے کیا ہیں۔ ماضی میں اس کے ساتھ کون سا واقعہ پیش آیا ہے اور اس واقعہ نے اس کے کردار پر کس قسم کی تبدیلی ڈالی اور اب اس کی موجودہ نفسیات کیا ہے۔

سب سے پہلے ڈراما "خدا زمین سے گیا نہیں ہے" میں مرد کردار زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کرداروں کے باعث کہانی میں جان پیدا ہوتی ہے، مگر چند ایک نسوانی کرداروں کی اہمیت بھی مسلّم ہے۔ ان میں سب سے پہلے پلوشہ کا کردار آتا ہے۔ پلوشہ کا کردار معصوم اور باحوصلہ لڑکی کا کردار ہے۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی ہے۔ جس کے نہ کوئی ارادے ہیں، نہ ہی کوئی منزل۔ وہ اپنے باپ اور بھائی کے تابع ہے انہوں نے اس کو گھر کی چار دیواری میں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ وہ باہر کی دنیا سے ناواقف ہے۔ اس کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں مگر اس کا معصوم ذہن اسے باور ضرور کرواتا ہے، کہ کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہو رہا ہے۔ اس کا باپ غلط لوگوں کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ وہ اس بات کا ذکر اپنے بھائی سے بھی کرتی ہے، مگر اس کا بھائی اس سے یہ بات کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ "بابا کبھی غلط نہیں ہو سکتا"۔ وہ ایک عام سی لڑکی ہے جس کے پاس جینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمارے قبائلی معاشرے میں آج بھی یہ بات دیکھی جاتی ہے، کہ بیٹی کو گھر کی چار دیواری میں رکھو۔ اس ڈرامے میں بھی بیٹی آزاد فضا میں سانس نہیں لے سکتی۔ وہ اپنی خواہشات کو دبا کر رکھتی ہے۔

انسان جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اس ماحول کا پروردہ کہلاتا ہے۔ اس کی سوچ، اس کا کردار اور اس کا ہر فعل اس ماحول کے مطابق ہو جاتا ہے، جس میں وہ زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ زندگی میں جب کبھی اس کا ماحول تبدیل ہوتا ہے تو اس کے کردار میں تبدیلی تو آتی ہے مگر اس کردار میں ماضی کے ماحول کی جھلک ہی نمایاں ہوتی ہے۔ ظلم و زیادتی کے خلاف ہر کوئی احتجاج کرتا ہے چاہے وہ احتجاج زبان سے، عمل سے یا خاموشی سے ہو۔ پلوشہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم و زیادتی کو روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ سادہ لڑکی مرد کی بری

نظر کو پہچان لیتی ہے۔ پلوشہ ایک کمزور کردار ہے۔ وہ اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ خود نہیں کر سکتی۔ اس کا باپ اس کارشتہ اپنی عمر کے مرد سے کر دیتا ہے۔ بظاہر شریف نظر آنے والا یہ مرد پلوشہ جیسی معصوم اور باکردار لڑکی پر بری نظر رکھ لیتا ہے۔ لڑکی چاہے جیسے بھی ماحول میں پرورش پائے، مرد کی نظر کو پہچان جاتی ہے اور وہ اس رشتے سے انکاریوں کرتی ہے۔ "تم بابا کو بول دو ہم کو وہ اچھا نہیں لگتا اس کا آنکھ میں تو شرم ہی نہیں ہے۔"(۴۱)

وہ سادہ اور عام سی لڑکی اپنی گہری باتوں سے اپنی سوچ کو اور اپنے اندر کی جھنجلاہٹ کو واضح کرتی ہے اور کہتی ہے کہ:

"پہلے بھی تو پتھر ہی ہے ہم، پتھر میں سانس لے رہا ہے۔ دفن ہونے سے ڈر نہیں لگتا
ادھر سب دیکھتا ہے، ہم کو اچھا نہیں لگتا ہے۔"(۴۲)

The interpretation of dreams کے بارے میں فرائیڈ کا کہنا ہے کہ ہماری نامکمل خواہشات ہمارے ذہن میں ہر وقت موجود رہتی ہیں جو انسان کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ یہ لڑکی بھی احساسِ کمتری میں مبتلا ہے اور گھبراہٹ اور خوف کے زیرِ اثر زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی نامکمل خواہشات اس کو نفسیاتی طور پر بدل کے رکھ دیتی ہیں۔ پلوشہ نے اپنے اوپر ہونے والے بڑھتے ہوئے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ مگر اس آواز میں لڑکھڑاہٹ واضح دکھائی دیتی ہے۔ جیسے وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتی ہے اور اس کے غصے سے تھر تھر کانپنے لگتی ہے۔ خوف میں اس کے منہ سے فقط لفظ "بابا" ہی نکلتا ہے اس ایک لفظ کی ادائیگی میں بہت کرب، دکھ اور تکلیف موجود ہے۔ پلوشہ کے انداز میں معصومیت، سادگی اور بے ساختگی ہے۔ بات کرتی ہے تو معصومانہ انداز میں کرتی ہے۔ اسکی باتوں میں اطمینان دکھائی دیتا ہے۔

بے جا پابندیاں اور قید انسان کو احتجاج کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب پابندی حد سے سوا ہو جائے تو پرندہ سونے کے پنجرے کو بھی توڑ کر اڑ جاتا ہے۔ انسان کو اللہ نے آزاد پیدا کیا وہ پابندیوں میں جکڑے جانا پسند نہیں کرتا ہے۔ انسان کی برداشت جب ختم ہو جاتی ہے تو وہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انسان کی نفسیات اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ پلوشہ بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ جب اس کا باپ اس کا رشتہ زبردستی اپنی عمر کے مرد سے طے کر دیتا ہے، تو احتجاج کرتی ہے۔ اسی احتجاج کے زیر اثر وہ اپنے بھائی باپ کے ساتھ نقل مکانی نہیں کرتی بلکہ فوج سے ڈرتے ہوئے جب خائستہ گل فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی بیٹی اسی

گھر میں چھپ جاتی ہے۔ اس وقت پلوشہ کے روپ میں ہمیں معصوم اور ڈری ہوئی لڑکی نظر نہیں آتی، بلکہ ایک جرأت مند بہادر لڑکی نظر آتی ہے۔ جو بظاہر اپنے عمل سے پریشان ہے مگر ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑی رہتی ہے وہ اپنے آپ کو سچ ثابت کرنے کے لیے تمام سادہ جملوں کا سہارا لیتی ہے۔ پلوشہ گھر سے بھاگ کر بھی اپنے باپ کی ضد کے آگے ہار جاتی ہے۔ یہاں پر پلوشہ کا بے بس روپ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے، وہ باپ کی چالوں سے بچ نہیں پاتی اور اپنے لیے موت مانگتی ہے۔ اس کے باپ سے یہ مکالمہ بہت واضح ہے وہ پلوشہ کی وجہ سے ایک لڑکی کو اغوا کروالیتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوتی ہے کہ:

"بابا۔۔۔ بابا میں بیٹی پلوشہ بابا تم چاہو تو ہمارا جان لے لو۔ امّ مرنے کو تیار ہے۔ تمہارا بھائی نے جس طرح ہمارا خیال رکھا۔ امّ کو پڑھایا امّ کو پہلی بار معلوم ہوا زندگی کیا ہوتا۔ امّ سو بار جان دینے کو تیار ہے لیکن عائشہ کو جانے دو۔"(۴۳)

پلوشہ کو تعلیم حاصل کرنے کا بھی شوق ہے۔ مگر وہ اپنے باپ کی حرکتوں پر بہت دکھی ہے۔ وہ چچا کے گھر آجاتی ہے۔ اس کی سوچ بدل جاتی ہے۔ اس کو تعلیم سے محبت ہو جاتی ہے اس کو زندگی کی حقیقت صحیح معنوں میں سمجھ آجاتی ہے۔ پلوشہ ایک ایسی لڑکی ہے جو قبائلی علاقے کی پروردہ ہے۔ اس کے انداز سے ہمیں اس علاقے کی عورت کے طور اطوار اور رہن سہن کا پتہ چلتا ہے۔ پلوشہ نفسیاتی لحاظ سے کمزور کردار ہے۔ جس کا ہر فعل اور عمل کمزوری کو واضح کرتا ہے جو حالات کے بدلاؤ سے اپنی سوچ اور نفسیات کو بدلتی چلی جاتی ہے۔

"زرمینے" رحمان گل کی بیٹی ہے۔ جس کے اندر اس کے باپ اور اس کے ماحول کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔۔ اس کی شخصیت مکالموں سے پہچانی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جو دوسروں کا درد جانتی اور سمجھتی ہے۔ اس کی ماں جب اسے یتیم بے سہارا بچوں کو پڑھاتے ہوئے دیکھتی ہے تو کہتی ہے کہ تو تو اپنا اسکول کھول دے بچے تو وہ ماں کو جواب دیتی ہے۔

"امی آپ نے تو میرے دل کی بات کر دی لیکن میں ایک نہیں کئی سکول کھولوں گی آپکو پتا ہے، یہ جو ہمارے ہاں امن کے لیے کام ہو رہا ہے اس کی پہلی شرط بھی تعلیم ہے اور یہ جتنے اسکول تباہ ہو رہے ہیں نہ اس سے دوگنا بنیں گے انشا اللہ۔"(۴۴)

اس کہانی کا ایک اور اہم کردار بانو ہے۔ یہ بے کس اور مجبور عورت ہے جو بہادری سے حالات کا مقابلہ

تو کرتی ہے مگر جب بات اس کی اولاد پر آجاتی ہے تو وہ مجبور، بے بس اور لاچار ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی اولاد کو اپنی طرح بہادر اور ثابت قدم بنانا چاہتی ہے مگر وہ اندر سے ایک کمزور اور ڈرپوک عورت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے سر سے شوہر کا سایہ اٹھ جاتا ہے اور وہ اکیلے حالات کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ جب بانو اپنے گھر سے باہر کھانے کا سامان لینے نکلتی ہے۔ تو نام نہاد مجاہد اس کو ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ اسی باعث اس کے اندر خوف سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔ جب کمانڈر اسے بے پردگی پر گھر میں محصور رہنے کا حکم دیتا ہے تو کمانڈر کو روتے ہوئے یوں جواب دیتی ہے۔ "بانو: بھائی میں بیوہ ہوں میرے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ مجھے بچوں کو ناشتہ دینا ہے کیا کروں میں۔"(۴۵) بانو ایک طرف تو ہمیں ثابت قدم اور مضبوط عورت دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف بے بس اور حالات سے سمجھوتہ کرنے والی عورت دکھائی دیتی ہے۔ مگر مرد حاکم ہو اور عورت مجبور تو کبھی بھی عورت کی نہیں سنی جاتی ہے۔ عورت مرد سے جیت نہیں سکتی۔ ایسا ہی بانو کے ساتھ بھی ہو۔ ابانو نے اپنے حوصلے سے مرد مجاہدوں سے مقابلہ کرنے کی کوشش تو کی مگر وہ ناکام رہی۔ مردوں نے اپنے طاقت کے بل بوتے پر اسے اغوا کر لیا اور اسے پاک فوج سے بدلہ لینے کے لیے قتل کروادیا۔ بانو کا قتل نام نہاد مجاہدین پر تو اثر انداز نہیں ہوا مگر بانو کے معصوم چھوٹے بچے ساری زندگی کے لیے اکیلے ہو گئے۔

اس ڈرامے کے نسوانی کردار تحت الشعور میں ڈوب کر عمل سرانجام دیتے ہیں۔ وہ اپنے شعور کو تحت الشعور سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ معمولی سے معمولی واقعات بھی ان کے کردار پر اثر انداز ہو کر ان کی نفسیات کو اور واضح کرتے ہیں۔

اگر اصغر ندیم سید کے ڈرامے "**تم ہو کہ چپ**" کے نسوانی کرداروں کی بات کی جائے تو ہمیں بہت خوبصورت، پُر کشش اور خواہشات کے پیچھے بھاگنے والے نسوانی کردار نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں میں زندگی کی رمق ایک حد تک دکھائی دیتی ہے۔ یہ کردار صرف سانس لیتے ہوئے حسین فانوس ہی نظر آتے ہیں ۔ جو حویلی کی زینت کے لیے سجائے گئے ہیں۔ ان کرداروں کی وجہ سے کہانی میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

ان کرداروں میں سب سے پہلا کردار "مشل" کا ہے یہ لڑکی خوابوں اور خواہشوں کے پیچھے بھاگنے والی لڑکی ہے۔ جو زندگی کو ایک الگ انداز سے دیکھتی ہے۔ اس کے لیے زندگی fairy tale سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے اس کے لیے خواہشوں اور من چاہی چیزوں کا حصول عام

سی بات ہے۔ کچے ناپختہ ذہن کی اس لڑکی کو بدترین حالات نے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ مشل خوابوں میں جینے والی لڑکی ہے۔ جو اپنے تخیل میں ضرار کے قبیلے کی ایک تصویر بنا لیتی ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لڑکی خوابوں اور خواہشات کے پیچھے بھاگنے والی ہے۔

"میں جب تمہاری tribe کے بارے میں سوچتی ہوں نہ تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ گھوڑے دوڑ رہے ہوں گے۔ یہاں سے وہاں برف ہو گی lakes ہو گی اور ان سب کے بیچ میں نہ ایک beautiful سا wooden villa ہو گا۔"(۴۶)

عورت چاہے مشرق کی ہو یا مغرب کی، عورت میں بہت سی قدریں مشترک رہتی ہیں ۔ مشل خود کو اس وقت دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی گردانتی ہے، جب اس کو اس کے خوابوں کا شہزادہ مل جاتا ہے۔ اس نے اپنے ذہن میں ایسے جیون ساتھی کا ہیولا تخلیق کیا جو شہزادوں کی سی آن بان رکھنے والا ہے۔ مشل ایک کم عقل لڑکی ثابت ہوتی ہے جو اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتی ہے۔ اس لڑکی کو جب پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑی خوبصورتی سے ٹریپ ہو چکی ہے۔ تو اس کا ردعمل قدرتی مگر دل دہلا دینے والا ہوتا ہے ۔ وہ چیختی چلاتی سر ٹکراتی ہے مگر سب لاحاصل ہوتا ہے۔ وہ ایک بے بس، لاچار اور کمزور ترین عورت ہے، جو سونے کے پنجرے میں قید ہے اور اس سے نکلنے کا راستہ صرف اس کی موت ہے۔ اس کی دھمکیاں اور دلائل بودے ثابت ہوتے ہیں۔

مشل کا کردار ڈرامے کے شروع سے آخر تک چھایا رہتا ہے، مگر بے بس، لاچار اور مجبور عورت اپنی مرضی سے سانس نہیں لے سکتی ۔ ڈرامے کے کلائمکس میں مشل کی زندگی میں خاص بدلاؤ نظر آتا ہے۔ وہ حویلی سے نکلنے کے لیے پھڑ پھڑاتی ہے اور پھڑ پھڑاتے ہوئے زخمی ہوتی ہے مگر ہار نہیں مانتی۔ آخر کار ڈرامے کے آخر تک نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اس کا ماننا ہے کہ "جو ظالم کے ظلم کو برداشت کرتا ہے وہ بھی ظالم ہی ہوتا ہے۔"

یہاں مشل کا ڈٹ جانا اور ہٹ دھرم رویہ ہمارے سامنے ایک نئی مشل کو لے آتا ہے، جو کچھ کرنے کی ٹھان لے تو کر کے رہتی ہے۔ وہ خود کو وقت اور حالات کے دھارے پر نہیں چھوڑتی بلکہ کوشش اور لگن سے حالات کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ وہ دھوکے اور دھوکا دینے والے شخص کو ناپسند کرتی ہے۔ ضرار کی اصلیت کھلتے ہی

اس کی محبت بھک سے اڑ جاتی ہے۔ وہ میر ضرار کے سامنے احتجاج کرتے ہوئے یہ الفاظ بولتی ہے:

"اٹھا کر پھینک دو مجھے آسمان سے، جس انسان نے مجھے اتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔ اس کا بچہ نہیں پیدا کروں گی میں۔"(۴۷)

مشل کی نفسیات ایک ایسی لڑکی کی نفسیات ہے جس میں لاابالی پن بھی ہے تو حالات کے باعث سمجھداری بھی ہے۔ مشل دوسروں کا درد سمجھنے والی اور دوسروں کا ساتھ دینے والی لڑکی ہے۔ اس کے باعث کہانی میں رنگینی اور رومانیت کا عنصر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کردار میں جینے کی امنگ شروع سے آخر تک موجود رہتی ہے۔ وہ حالات کے باعث مرنے کے بجائے جینے کو فوقیت دیتی ہے اور زندگی گزارنے کے بجائے زندگی جینے کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ حویلی کی معصوم لڑکیوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ اس کی صدائے احتجاج بس حویلی کی دیواروں سے ٹکرا کر اس تک واپس پہنچ جاتی ہے۔ اس کا احتجاج کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بقول ڈرامانگار:

"میں کردار کو کلّی حیثیت میں دیکھتا ہوں۔ وہ جس واردات میں گرفتار ہوتا ہے، اس میں اس کے محرکات اس کی الجھنیں اضطراب اور اس کا جذباتی پسِ منظر میرے لیے اہم ہوتا ہے۔"(۴۸)

زندگی کے حالات انسان کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ وہ حویلی سے نکلنے کے باوجود بھی زندگی بھر اس ٹرانس سے نہیں نکل سکی۔ اسی باعث وہ لاابالی، ہنستی مسکراتی لڑکی سنجیدہ شخصیت کے روپ میں کہانی کے اختتام میں نظر آتی ہے۔ اس کے الفاظ اس کے لہجے کا ٹھہراؤ ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی نے اس کو بہت کچھ سکھایا ہے۔

ڈرامے کا ایک اور اہم کردار **بی بی جانم ہے۔** جو اپنی وضع قطع کے اعتبار سے ایک بارعب شخصیت ہیں۔ ان کی شخصیت کا سحر پوری حویلی پر چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ باپردہ خاتون جو حویلی کی چار دیواری میں قید ہے۔ اس کے باعث حویلی کا حسن دوبالا ہے۔ بی بی جانم ایک ایرانی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ آغاز میں ہمیں بی بی جانم ریاست کی ملکہ دکھائی دیتی ہے، اور مشل کو اس حویلی کی حقیقت ان الفاظ میں بتاتی ہیں۔

"یہ بندی خانہ ہے بندی خانہ! اللہ کی دنیا کا بندی خانہ جس میں ہم سب قید ہیں اسی کو

قیدی حیات بولتے ہیں۔"(۴۹)

بی بی جانم کو سردار جمال خان بے بس اور تنہا کر کے اپنے پاس قید کر لیتا ہے۔ اس کے سارے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اپنے غم کی داستان مشل کو بتاتی ہیں کہ کیوں وہ ایسی صبر کرنے والی بن گئیں اور حالات سے سمجھوتا کر لیا۔

"بی بی جانم: ایران میں پوری فیملی کو مار دیا سب کو ختم کر دیا میں اکیلی رہ گئی تھی پھر میں نے poetry میں شاعری میں اپنی آپ کو چھپا لیا اور شاعری نے مجھ کو بچا لیا میں نے احتجاج کو برداشت بنا لیا صبر۔"(۵۰)

بی بی جانم کا کردار خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ ملکہ تو ہے مگر ایسی ملکہ جس کی جان اس کے بادشاہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بادشاہ کے زیرِ تسلط زندگی گزار رہی ہے۔ بی بی جانم ایک ایسی خاتون ہے جو ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتی بلکہ وہ صبر کر کے ظالم کے ظلم کو اور بڑھاوا دے دیتی ہے۔ مشل اور بی بی جانم دونوں کی کہانی ایک جیسی ہی ہے، مگر بی بی جانم نے مشل کی طرح احتجاج نہیں کیا بلکہ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ وہ ایک ایسی بے کس اور مجبور خاتون ہے جو خود سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی اور اللہ سے لو لگا لیتی ہے۔ وہ بظاہر اطمینان کی زندگی گزار رہی ہے، مگر اس کی ذات میں ہمیں ایک بے چینی نظر آتی ہے۔ ٹھہراؤ تو ہے مگر کہیں نہ کہیں طغیانی بھی پائی جاتی ہے۔

یہ کردار ایک باوفا عورت کا کردار ہے، جو ہر حال میں شوہر کے ساتھ وفا کرتی ہے۔ اس عورت کے اندر بے انتہا دکھ، درد، یاس و ناامیدی سمٹ آئی ہے۔ جس کے پاس جینے کی وجہ اس کا بیٹا ہے۔ اس عورت نے حالات کا مقابلہ صبر سے کیا۔ اس کے نزدیک شوہر کی چوکھٹ پار کرنا جرم ہے۔

بی بی جانم اپنے لہجے کے ٹھہراؤ کے اعتبار سے دوسرے کو مرعوب کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ بی بی جانم کا کردار کم گو خاتون کا کردار ہے۔ اس کے مکالمے زیادہ تو نہیں مگر جتنے بھی ہیں، بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے مکالموں میں فلسفہ پایا جاتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اس خاتون کو حالات نے بہت کچھ سکھایا ہے اور فلسفہ حقیقت کا گہرا مطالعہ کیا ہوا ہے۔

بی بی جانم۔

"یہ تو عورت ذات کا مقدر ہے۔ زیتون بانو وہ کبھی اپنے باپ کے لیے کبھی بھائی کے لیے ، کبھی شوہر کے لیے، اس کے جرم کو اپنی چادر میں چھپانا پڑتا ہے ڈھانپنا پڑتا ہے۔"(۵۱)

بی بی جانم کے یہ الفاظ ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ ایک ایسی عورت ہے جو اپنے رشتوں کے لیے سب کچھ قربان کرنے پر تیار رہتی ہے۔بی بی جانم ڈرامے کے اختتام تک پہنچتے ہوئے ہمیں بغاوت کرنے پر مجبور دکھائی دیتی ہے۔اس کی سوچ مشل کے باعث بدلنے لگتی ہے۔وہ ظلم کو سہتے سہتے بغاوت پر مجبور ہو جاتی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ میں زندگی میں کوئی ایک کام اچھا کرنا چاہتی ہوں۔ اسی باعث وہ مشل کو حویلی سے بھگانے میں مدد دیتی ہے اور سردار جمال خان کے سامنے یوں اعتراف کرتی ہے۔

"سردار: اس دل آزاری اور اس غداری کا کیا وجہ تھا جانم، خانم۔

بی بی جانم: جواب تو آپ جانتے ہیں مگر پھر بھی میری زبان سے سننا چاہتے ہیں تو سن لیں یہ درست ہے کہ تہ خانے کے راستے میں نے ہی اس کو نکالا ہے۔میں نے غداری کیا آپ کے ساتھ اور یہ غداری مجھ کو بہت پہلے ہی کر لینی چاہیے تھی، کیونکہ ظلم کو برداشت کرنے والا ظالم کے ہاتھ کو اور مضبوط کرتا ہے۔ ظلم کو سہنا ظالم کی مدد کرنا ہے۔ غلطی پر تو میں بھی تھی جس نے اپنے آپ کو اپنی شاعری اور درویشی میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ظلم کی اس چادر میں اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی۔ مجھ کو تو مشل نے آزاد کیا اس کے لفظوں کی زنجیروں نے میری سوچ کو آزاد کیا اور میں اب آزاد ہوں۔"(۵۲)

اس کی زندگی ایک کمرے تک محدود دکھائی دیتی ہے اپنے شوہر کا ہر غلط کام، ہر غلط بات اس لیے برداشت کرتی کہ اس کے شوہر نے اس سے محبت کی شادی کی ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے شوہر کی دلہنوں کو اپنے ہاتھوں سے سجاتی ہے، مگر اس ڈرامے میں بی بی جانم، مشل، پری وش، بی بی گل بانو تینوں کا غم ایک جیسا ہے اور اس بات کو سننے کا حوصلہ وہ بہت پہلے ہی اپنے اندر مجتمع کر لیتی ہے۔

معاشرے میں جب ایک عورت گھریلو مسائل سے گزرتی ہے تو اس پر نفسیاتی مسائل غلبہ ڈال دیتے

ہیں جس کے باعث وہ مسلسل ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ڈپریشن کسی بھی انسان کی زندگی پر براہِ راست اثرانداز ہوتا ہے۔اس کیفیت سے نکلنا انسان کے لیے بہت ضروری ہے۔یہ کردار ڈپریشن کا شدید شکار ہے ،جو اندر اندر گھلتا رہتا ہے۔

اس کردار کا خاتمہ اس وقت ہوتا جب سردار جمال خان مشل کو حویلی سے بھاگنے میں مدد کرنے پر اس کو زندہ درگور کرنے کا حکم سناتا ہے۔ادھر ہمیں لاحاصل عورت کی مکمل تصویر نظر آتی ہے۔جو مجبور تھی مگر امید پر قائم تھی کہ اس کا شوہر اسے پسند کرتا ہے۔مگر سردار اس کی پہلی اور آخری غلطی کو معاف نہیں کرتا بلکہ اپنی سنائی گئی سزا پر عمل کر ڈالتا ہے۔یہاں منظر ہمیں تناؤ اور ناامیدی سے روشناس کرواتا ہے۔اور بد سے بدترین سزاؤں کا بھیانک چہرہ بھی دکھاتا ہے۔بی بی جانم کو جب قبر میں اتارا جاتا ہے تو وہ اِن لفظوں کے ذریعے اپنے اندر کا غبار نکالتی ہے۔

> "سردار جمال خان میر شاکر کے اس کارنامے کو کوئی جاہل اور بزدل قوم بہادری کا نام دے سکتی ہے مگر ایک تہذیب یافتہ قوم ایک ایسے آدمی کو جس نے کسی معصوم بچے کی گردن کاٹی ہو، بہادر نہیں مان سکتی۔آپ نے اور آپ کے فرزند نے جو کچھ آکسفورڈ میں پڑھا بھلا دیا، اور یہ کتابیں جو آپ کی لائبریری میں ہیں ان کو جلا دیں، کیونکہ یہ سب پڑھنے کے بعد بھی صرف آپ کی فرسودہ روایات ٹپک رہی ہیں۔ان کتابوں کا علم نہیں۔"(۵۳)

اس ڈرامے میں عورت ظلم کی چکی میں پستی ہوئی بے بس اور مجبور دکھائی دیتی ہے۔اس کے پاس فرار کا صرف ایک ہی راستا موت کی صورت میں موجود ہے۔مشل اس حویلی سے فرار تو ہو جاتی ہے مگر وہ اگلی پوری زندگی اپنے آپ کو اس ٹرانس سے نکال نہیں سکتی۔وہ آزاد ہو کر بھی ماضی کے بھیانک چہروں میں قید رہتی ہے۔

"دل تو بھٹکے گا" ایک ایسا ڈراما ہے جس میں کہانی مخصوص کرداروں کے گرد چکر کاٹتی ہے، اصغر ندیم سید جہاں مرد کرداروں کی نفسیات کو ابھارتے ہیں وہیں عورتوں کی نفسیات کو بھی عمدہ طریقے سے پیش کرتے ہیں۔اصغر ندیم سید کے کرداروں کی نفسیات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورت کی نفسیات، سوچ، ظاہر

و باطن کا گہرا علم رکھتے ہیں۔ اصغر ندیم سید نے اس ڈرامے میں عورت کا پیچیدہ موضوع پیش کیا ہے۔ جس کو کوئی عام لکھاری اپنی تحریر میں اتنے عمدہ انداز میں نہیں لکھ سکتا۔ انہوں نے عورت کے جذبات واحساسات کی عکاسی نہایت سلجھے ہوئے انداز میں کی ہے۔ انہوں نے عورت کے داخل کو پرکھا ہے اور بہت عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔

یاسمین کا کردار ایک ایسا کردار ہے۔ جو ہر لحاظ سے توجہ طلب ہے۔ یاسمین کی حالت ایک غمزدہ عورت کی ہے۔ ایسی عورت جو اپنے خوابوں اور خواہشوں کو پورا نہ کر سکی۔ ہمارے ہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد گھر کا سربراہ اور افراد خانہ کا حکمران ہے چنانچہ اس کی خواہشوں کی تکمیل بہت ضروری ہے۔ اس کے جذبات اس کی ذات ہی اہمیت کی حامل ہے، جبکہ عورت کا درجہ عام فرد کا ہے۔ اس کے جذبات واحساسات لایعنی ہیں۔ اس کے جذبات کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کی نفسی خواہشات کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ ہمیشہ مرد کی خواہشات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ کچھ گھرانوں میں ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی کو سات پردوں میں قید کر کے رکھا جاتا ہے۔ اس کی پرورش بہت خوبصورت انداز میں کی جاتی ہے۔ اس کو جیسا ماحول دیا جاتا ہے اس کو وہی بہتر لگتا ہے۔ وہ اس ماحول اس دائرے سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہے۔ وہ ایک محدود دائرے کے گرد چکر کاٹتی رہتی ہے

۔

ایسی لڑکیاں شادی کے بعد اپنے آپ کو بدلنے پر بہت مشکل سے راضی ہوتی ہیں جس کے باعث ان کی شادی شدہ زندگی کامیاب نہیں ہو پاتی۔ وہ اپنی زندگی میں خوشیوں کے لیے ترستی رہتی ہیں۔ اس کے انداز و اطوار بدلے نہیں بدلتے۔ ایسا ہی یاسمین کے ساتھ ہوا۔ یاسمین کی زندگی بھی بہت ہی پرسکون تھی۔ امیر خاندان کی بیٹی جو بہت بڑی جائیداد کی اکیلی وارث تھی۔ اس کی شادی زمیندار گھرانے میں ہوئی مگر عیش پسند شوہر نے اس کو محرومیوں اور دکھ سے دوچار کر دیا۔ اس کے شوہر نے اس کو بیوی کا مقام نہیں دیا۔ یاسمین کو اپنی کم مائیگی کا احساس اس وقت ہوتا ہے۔ جب اپنے دیور کے لیے دلہن بیاہ کر لاتی ہے۔ اس کو اپنی زندگی کے پانچ سال گزرنے کا بہت دکھ ہوتا ہے۔ سادہ طبیعت سادہ لڑکی اپنے شوہر کا دل نہ جیت سکی اور زندگی گزارتی رہی۔ یہ ایک عام لڑکی ہے جو ہمیشہ سادگی کو ہی حسن سمجھتی رہی اور اس سادہ مزاجی نے اسے زندگی کے رنگوں سے محروم رکھا۔ ادھر یاسمین ناسمجھ دکھائی دیتی ہے۔ اس کے چہرے کی اداسی اس کو زندگی کے رنگوں سے

محروم رکھتی ہے۔ اس کا شوہر اس کو کئی بار ظاہری وضع قطع بدلنے کا کہتا ہے، حسن بانو اس کی دیورانی اسے بتانے کی کوشش کرتی ہے کہ تم بھی اسی طرح سجو سنورو۔ مگر یاسمین اسے فاحشہ اور غلط عورت ہونے کی گالی دیتی ہے۔ یاسمین کی کم فہمی، بے عقلی اور احساسِ کمتری اس کو غلط راہ پر لے چلتی ہے۔

فرائیڈ کے شاگرد ایڈلر کا خیال ہے کہ احساس کمتری انسانی زندگی پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ احساس کمتری کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز سے محروم ہوتا ہے تو وہ دوسروں کے مقابلے میں خود کو حقیر یا کمتر سمجھنے لگتا ہے۔ ایڈلر کہتا ہے کہ یہ احساس شروع سے آخر تک انسان کو گھیرے رہتا ہے۔ مثلاً کمزور جسم، کم ذہنی صلاحیت اور تجربے کی کمی کے سبب بچہ اپنے ماں باپ کا محتاج ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں کمتری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ آگے چل کر بھی وہ قدم قدم پر دوسروں کے سہارے اور سماج کی مدد کا محتاج ہے۔ غرض انسان کو ساری زندگی احساس اکمتری سے نجات نہیں ملتی۔ فرد اسے کس طرح برداشت کرتا ہے اور کس کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ اسی ردعمل سے انسان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ کوئی احساس اکمتری پر قابو پانے کے لیے خود کو دوسروں سے برتر ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے احساس برتری کہا جاتا ہے۔

یاسمین کے مکالمے ہمیں اس کی ذہنی سطح بتاتے ہیں اس کے خیالات ہمیں اس کے مکالموں سے پتہ چلتا ہیں۔ وہ سادگی کو شرافت سمجھتی ہے مگر اس کے برعکس حسن بانو جو اسی گھر کی بہو بن کر حویلی میں آتی ہے۔ وہ فیشن کو شرافت کا نام دیتی ہے۔ مگر شرافت کے یہ الگ الگ روپ ایک کے لیے دکھ اور دوسرے کے لیے خوشیاں لے کر آتے ہیں۔

یاسمین جب اپنے جذبات کو سلا سلا کر تھک جاتی ہے تو اس کے لیے زندگی امتحان بن جاتی ہے۔ یاسمین اپنی دیورانی کو دیکھ کر بن پانی مچھلی کی طرح تڑپتی ہے۔ اس کی سوچ اس وقت بدلتی ہے جب اس کا شوہر اس کو اس کا اصلی چہرہ دکھا کر جاتا ہے۔ یاسمین اپنی زندگی کے پانچ سال ضائع کر کے اپنے شوہر کے رنگ میں ڈھل جاتی ہے۔ کہانی اس وقت اہم موڑ پر اختیار کرتی ہے جب یاسمین دلہنوں کی طرح سج سنور کر اپنے شوہر کے انتظار میں بیٹھتی ہے تو اس کا شوہر اس سے ہمیشہ کے لیے بے وفائی کر کے اس جہان سے چلا جاتا ہے۔ تب یاسمین غم میں نہ رو پاتی ہے نہ اس غم کا اظہار کر پاتی ہے۔ سجی سنوری یاسمین پر قیامت ٹوٹتی ہے۔

اس کا شوہر اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتا ہے۔ شوہر کی جدائی کے بعد اس کو احساس ہوتا ہے کہ

میری خواہشات بے لگام ہوتی جارہی ہیں۔ اپنے نفس کو سلاتی ہے مگر ملازم کے سامنے آنے سے بار بار شوہر کی نارسائی اور جدائی کا غم تازہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بیوہ لڑکی کی بھی جلد از جلد شادی کر دی جائے۔ یاسمین کی جائیداد گھر میں رکھنے کی وجہ سے اس کی شادی کروانے کا فیصلہ دیور سے کیا جاتا ہے، مگر وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے اور اس سے نکاح پر انکار کر دیتا ہے۔ یاسمین دیور شمائل سے خود کہتی ہے کہ مجھ سے نکاح کر لو۔ یہ مکالمے یاسمین کی بے بسی کی انتہا کو ہمارے سامنے لاتے ہیں کہ کس طرح وہ پاک رشتے کی بھیک مانگتی اور اپنے آپ کو گناہ سے بچانے کی سعی کرتی ہے۔ مگر اس سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے۔

یاسمین:

> "بس ایک لمحے نے مجھے کمزور کر دیا مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی۔ اپنے اندر کی عورت کو روک نہ سکی اب اس حویلی کی عزت صرف تمہارے ہاتھ میں ہے شمائل میں ماں بننے والی ہوں۔"(۵۴)

ادھر یاسمین جیسی شریف خاندان کی لڑکی بھی بے بس نظر آتی ہے۔ اصغر ندیم سید ہمیں عورتوں کے اندرونی خلفشار اور خواہشات کے بارے میں بتاتے ہیں، ادھر عورت کی نفسیات کھل کر سامنے آتی ہے۔ یاسمین جسے اپنی پاکدامنی اور شریف ہونے پر بہت گھمنڈ ہوتا ہے۔ اس کے نفس کا بے لگام گھوڑا اس سے اس کی پاکدامنی اور شرافت چھین لیتا ہے اور اس سے گناہ کبیرہ کروالیتا ہے۔ یاسمین اپنے ملازم کے ساتھ ناجائز تعلق بناتی ہے اور جب اسے ماں بننے کی خبر ملتی ہے تو وہ بھیک مانگتی ہے۔ شمائل اس کو انکار نہیں کر پاتا اور سب کچھ جانتے ہوئے نکاح کر لیتا ہے۔ یاسمین کی نفسیات اس ڈرامے میں واضح ہے کہ کیسے اور کن محرکات کی بنا پر وہ گناہ کی مرتکب ہوئی اور اس کی بے رنگ زندگی اس کو اس موڑ پر لے آئی۔ یاسمین کے یہ الفاظ عورت کے جذبات کی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔

> "میں وہ ہوں جس کی بدنصیبی قدم قدم پر اس کے ساتھ چل رہی ہے، خواب تھے میرے بھی جذبات تھے لیکن ہوا کیا یاسمین نہیں یہاں ایک عورت اپنا دکھ بیان کر رہی ہے یعنی کتنی صدیوں کی راتیں گزارتی چلی گئی، اور اس کے شوہر نے کبھی بھی خوشی سے اس کا ہاتھ نہیں تھاما اور عورت کے اندر کے جذبات ابھرتے رہے، چوں کہ

عورت ایک مشین نہیں ہوتی جسم اور تقاضوں سے بھرا ہوا وجود ہوتی ہے۔ کیا معلوم گناہ کے لیے نہیں بھٹکتی وہ صرف اپنے تقاضوں کے لیے بھٹکتی ہے جو بھی اس کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ امر بیل کی طرح ہوتی ہے۔ سلگتی ہوئی گھڑی میں جو بھی اس کے قریب آجائے وہ اس سے لپٹ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ گناہ ہو۔ جس کی جڑیں ضرورت کی زمین میں ہوتی ہے۔"(۵۵)

یہ وہ الفاظ ہیں جس سے یاسمین اپنے ذہن کی عکاسی کرتی ہے۔ یاسمین نے اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کی بہت کوشش کی، لیکن یہ ایک الجھا ہوا کردار ہے، جو اپنی کم فہمی کے باعث زندگی کو مشکل بنا دیتی ہے۔ یاسمین کو خاندان والے مارنے کی کوشش کرتے ہیں تو شمائل اسے بچا کر شہر لے آتا ہے۔ یاسمین کی زندگی اس وقت رنگوں سے بھر جاتی ہے۔ جب اس کا حقیقی شوہر اسے تحفظ، عزت اور محبت دیتا ہے۔ یہاں کہانی کا اختتام تو ہوتا ہے مگر یاسمین کی خوشیوں بھری زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ یاسمین لالچی نہیں بلکہ وہ دکھوں کی ماری ہوئی لڑکی تھی۔ جس نے دولت کے بجائے اپنے بچے کی زندگی کو فوقیت دی۔ اس نے اپنی اولاد کو بچانے کے لیے اپنی کروڑوں کی جائیداد کسی اور کے نام کر دی۔ اس خاندان کے ذریعے ڈراما نگار عائلی زندگی کے تحت پنپنے والی بے بسی اور یاسمین کے لاشعور میں جمع ہونے والی خواہشات کو بیان کرتے ہیں۔ ڈراما نگار اس کردار کے ذریعے بیوہ کی داخلی اور خارجی مسائل کو آشکار کرتے ہیں۔

حسن بانو ایک خوبصورت لڑکی کا کردار ہے۔ اس کی سرشت میں ہر چیز حاصل کرنے کی بے چینی شامل ہے۔ اس کی وضع قطع زمانہ ساز، ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکی کی ہے۔ اس کی ظاہری سجاوٹ اس کے اندر کا بھی پتہ دیتی ہے۔ وہ حالات کا رخ اپنی مرضی سے بدلنے کی طاقت رکھتی ہے۔ وہ حالات کو اپنی چاہ میں ڈھال دیتی ہے۔ حسن بانو کا کردار مرکزی نہیں ذیلی ہے، مگر اس کی حیثیت کہانی میں تلاطم پیدا کرنے سے ذیلی نہیں بلکہ اہم ہو جاتی ہے۔ حسن بانو اپنے شوہر کو لبھاتی اور اس کو قابو کرنے کے لیے اسے رقص بھی دکھاتی ہے تاکہ وہ اس کے قابو میں رہے اور اس کی ہر بات مانے۔ حسن بانو کے مکالمے اس کو تجربہ کار لڑکی ظاہر کرتے ہیں ے جو زمانہ ساز اور ہر بات کو سمجھنے والی ہے۔ اس کی ساس کو اس کے اطوار پسند تو نہیں آتے مگر وہ اس لیے خاموش رہتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو خوش رکھتی ہے۔ اس کی انہی عادات کے باعث اسے اس کے خاندان کا طعنہ دیا

جاتا ہے کہ اس کی ماں ناچنے والی اور فلموں میں کام کرنے والی عورت ہے۔ حسن بانو بھی اپنے طور اطوار سے اپنے محرم کو خوش کرتی ہے۔

"مجھے دیکھیے بھابی میں بھی تو اس حویلی میں آئی تھی اور آتے ہی اپنا حق چھین لیا، اور بتا دیا کہ ایک عورت میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ اسی حویلی کے مرد سے میری شادی ہوئی تھی اس مرد کی بھی یہی عادتیں تھیں، جو آپ کے مرحوم شوہر کی تھیں، مگر میں نے کیا کیا میں نے اپنی ارادوں سے اپنے شوہر کو زیر کر لیا۔ جو عورت اپنے شوہر کو لبھانہ سکے اسے اپنے قابو میں نہ کر سکے وہ عورت کہلانے کو قابل ہی نہیں ہے، اس کا یہی انجام ہونا چاہیے جو آپ کا ہوا ہے۔"(۵۶)

حسن بانو کا کردار ڈرامے میں رنگینی بکھیرتا ہے۔ اس کی سوچ اور اس کے خیالات اس کے مکالموں سے واضح ہیں۔ حسن بانو بے شک لاابالی طبیعت کی مالک ہے مگر اس میں بھی ایک حساس لڑکی موجود ہے۔ جو اپنی جیٹھانی اور اس کے بچے کو گھر سے بھگانے میں اس لیے مدد دیتی ہے کہ کوئی ناحق نہ مارا جائے۔ اس کے آخری مکالمے توجہ طلب ہیں۔

"کیا کمی تھی میری محبت میں اور کتنی خدمت کرتی آپ کی۔۔۔۔۔ کیا نظر آرہا ہے آپ کو بھابی کا جرم اور ان کی سزا، صدیوں پرانی سوچ، اگر آپ کی آنکھیں کھل ہی گئی ہیں تو سنیے۔ ایک عوررت کو اس کے جرم کی سزا دینا ضروری ہے اس کو مارنا ضروری ہے کیوں کہ وہ عورت ہے، اپنا سر جھکا دے گی، یہ نہیں سوچا ہے کہ وہاں دوسری عورت موجود ہے، جو کسی بھی وقت اسے بچا سکتی ہے۔۔۔۔۔ یہ واقع میری وجہ سے نہیں ہوا سجاول ہاں ایک عورت کو ضرور بچایا ہے جس کا مجھے کوئی پچھتاوا نہیں چاہے اس کے لیے میرا گھر ہی کیوں نا برباد ہو جائے۔۔۔۔۔ تو پھر ایسی سوچ والے کے ساتھ رہنے کا بھی کیا فائدہ جایئے رہیے اپنے بابا کے سائے میں۔ کھودیے عورتوں کی قبریں مار ڈالیے انھیں ان کی ماں کی گود میں یا کوکھ میں جا رہی ہوں میں اپنی ماں کے گھر۔"(۵۷)

یہ وہ الفاظ جس سے حسن بانو کی سوچ ہم پر واضح ہوتی ہے۔ وہ جیسی نظر آتی ہے ویسی نہیں ہے۔ یہاں

ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حسن بانو تہی داماں رہی۔ اس کا شوہر اپنے باپ کے ڈر سے اسے خود سے الگ کر دیتا ہے۔ لڑکی جس ماحول میں پرورش پائے اسی ماحول کو تا عمر یاد رکھتی ہے۔ لیکن ماحول کے بدلاؤ کو جتنی جلدی قبول کر لیا جائے اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ حسن بانو کی لالچی طبیعت اس کا گھر برباد کرنے کا سبب بنتی ہے۔ ہوس کی ماری ہوئی لفظوں کے جال میں جکڑ کر شوہر کو قابو کرتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے عائلی زندگی کو بھی بھرپور طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔

اس کہانی میں ذیلی کرداروں کی بھرمار نہیں ہے۔ مگر اس خاندان کے تیسرے بیٹے کے ساتھ جڑی لڑکی صوفیہ کہانی کو تکمیل تک پہنچانے میں اہمیت رکھتی ہے۔ صوفیہ اپنے دوست کے عشق میں مبتلا ہے، مگر اس کے اندر ایک انّا موجود ہے۔ وہ ظاہر و باطن دونوں میں مکار ہے۔ ایک غریب گھرانے کی مادیت پسند لڑکی ہے ۔مادی چیزوں کو پانے کی ہوس رکھتی ہے۔ اپنی ہوس کو پورا کرنے کے لیے اپنی حقیقت سب سے چھپا کر رکھتی ہے، حتیٰ کہ اپنے آشنا کو بھی اپنی حقیقت نہیں بتاتی۔ معاشرے میں بہت سی کم عقل اور غریب طبقے کی لڑکیاں ، پیسے کی چمک دمک کو زندگی سمجھ بیٹھتی ہیں اور غلط راہ کا انتخاب کر لیتی ہیں۔ یہ شاطر لڑکی ہر طرح سے لوگوں کو ٹریپ کرنے کی کوشش میں غلط شناخت کا سہارا لیتی ہے اور اپنے آپ کو امیر باپ کی بیٹی بتاتی ہے۔ جس کے باعث لوگ اس کو رشک و حسد کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر کی سب سے مہنگی جامعہ کا انتخاب کرتی ہے۔ جس میں داخلے کے لیے اس کے پاس پیسے موجود نہیں ہوتے۔ وہ پیسے حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو ایک بزنس مین شخص کے ہاتھوں بیچ دیتی ہے۔ وہ آدمی ہر ماہ اس کو ایک خطیر رقم دیتا ہے۔ جس سے وہ اپنے آپ کو معاشرے میں امیرانہ مقام دلوانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ صوفیہ کی نفسیات مادیت پسندانہ ہے۔ یہ لڑکی جذبات تو رکھتی ہے مگر باطن سے زیادہ ظاہر پر توجہ دیتی ہے۔ اس کے نزدیک اس کا نام، مقام اور مرتبہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایک جذباتی لڑکی ہے جو جلد بازی میں فیصلے کرتی ہے مگر وہ اس بات کو نہیں سوچتی کہ اپنے آپ کو نیلام کر کے وہ مرتبہ تو پا رہی ہے، مگر عزت کھو رہی ہے۔ وہ عزت جو اس کے باپ نے غربت میں بھی قائم رکھی۔ بزنس مین اس کو بہت آسانی سے نیلام کر دیتا ہے۔ یہ لڑکی ایسی ہے جو گر کر سنبھلتی نہیں بلکہ اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالتی ہے اور گناہ کو چادر کی طرح اپنے گرد لپیٹ لیتی ہے۔ نفسیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو صوفیہ مادی خواہشات کے پیچھے بھاگنے والی ہے۔ اس کا حرص اور لالچ

اسے برباد کر دیتا ہے۔ وہ آزاد تلازمہ خیال کے ذریعے اپنے گرد حسین خوابوں کا ایک جال بن لیتی ہے جسے سوچنا اس کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

اس ڈرامے میں **ماں** کا کردار عام روایتی عورت کا کردار ہے۔ جس میں اولاد کو خوش دیکھنے کی لگن ہے۔ وہ تین جوان بیٹوں کی ماں ہے۔ اس عورت کا غرور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کردار میں معاملہ فہمی نہیں ہے وہ گھر کے مسائل کا حل جادو کا توڑ کروا کر کرتی ہے۔ اس کے نزدیک اس کی سمدھن اس کے گھر پہ جادو کروا رہی ہے۔

ماں:

> "فیصلہ تو ہو چکا اس کی ماں کے دیے تعویز پکڑے گئے ہیں، وہ ہم سب کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ پھر میں نے اسے حویلی سے نکال دیا۔"(۵۸)

اس کردار میں انّا، غرور اور سب سے بڑھ کر جاگیر دارانہ سوچ ہے۔ وہ حویلی کا نظام اپنے ہاتھوں میں رکھتی ہے اور اپنی مرضی کے خلاف کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس کردار کی فطرت اس کے ماحول کے باعث ہے۔ اس عورت کا غرور اس وقت ٹوٹتا ہے جب اس کا ایک بیٹا بیوی کا غلام بن جاتا ہے اور ایک شہر جا کر بس جاتا ہے۔ تب اسے سمجھ آتی ہے، کہ میں سب کچھ پا کر بھی خالی ہاتھ رہی۔ اس کردار میں بدلہ لینے کی بھی عادت موجود ہے۔ وہ بہو کو سزا دینے کے لیے زندہ قبر میں بھی اتروا سکتی ہے اور بہو کو طلاق بھی دلوا سکتی ہے۔ عورت ہونے کے باوجود وہ اپنے جیسی عورت کو معاف نہیں کر سکتی، بلکہ اسے اس کے انجام تک پہنچا آتی ہے۔ وہ عورت ہو کر دوسری عورت کا گھر بھی برباد کر سکتی ہے۔ وہ بیٹے کو یہی ترغیب دیتی ہے کہ ایک نا سہی دوسری سہی۔ اس کے یہ جملے اس کی ذہنی سطح کی عکاسی کرتے ہیں۔

> ماں: "اگر تو اسے واپس لے کر آئے گا تو وہ تجھ سے بدلہ لے گی۔ میں تو کہتی ہوں جانو پُتر تو اسے دو حرف لکھ کے بھیج دے۔ میں تیری شادی اپنے ہی جیسے کسی اونچے گھرانے میں کرواؤں گی۔ میرے پُتر کی عمر ہی کتنی ہے! ویسے بھی اس نے تجھے دیا ہی کیا تھا ایک اولاد تو دے نہ سکی۔"(۵۹)

بول میری مچھلی:

"بول میری مچھلی" ایک عام کہانی ہے جو ہمارے متوسط طبقے کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کی زندگی اور زندگی میں آنے والی مشکلات کو پیش کرتی ہے۔ اس کہانی میں نسوانی کردار ایسے کردار ہیں جو عام طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کے اندر بناوٹ تو نہیں مگر پانے کی چاہ ضرور موجود ہے۔ ان کرداروں کے ذریعے ہمیں ایک عام دنیا دکھائی دیتی ہے۔ سانس لینے کی تمنا اور جینے کی خواہش ان کو مشکلات سے دوچار کر دیتی ہے۔ کہانی کا تانا بانا کسی مرکزی کردار کے گرد نہیں بُنا گیا بلکہ ایک مجموعی فضا کے عمل میں بہت سے کردار شامل ہو جاتے ہیں۔ بقول نفسیات دان:

> "موجودہ دور میں تطبیق یعنی حالات اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنا ہماری روزمرہ زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ دن بدن تطبیق سے تعلق رکھنے والی کتابوں، رسالوں، کتابچوں اور مضامین کی اشاعت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس سے ہم اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ لگاسکتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ موجودہ صدی میں عدم استقلال اور تشویش کا دور دورہ ہے۔ دنیا اس قدر پیچیدہ اور زندگی اتنی دشوار ہو چکی ہے کہ ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔"(۶۰)

مزید لکھتے ہیں کہ:

> "آج نفسیاتی اختلال اور باہمی تعلقات سے تعلق رکھنے والے مسئلے بہت بڑھ گئے ہیں زندگی کا جدید طرز نسبتاً زیادہ تیزی کے ساتھ ایسے انسان پیدا کررہا ہے، جو نقصِ مطابقتmall adjustment کا شکار ہیں۔ ملک میں دوسرے مسائل تو ہیں ہی ذہنی صحت بھی ایک بڑا مسئلہ بن گئی ہے۔ ذہنی پریشانیوں میں مبتلا افراد کے لیے جو سہولیات مہیا کرائی جاسکتی ہیں وہ ان کی تعداد کو دیکھتے ہوئے قطعی ناکافی ہے۔"(۶۱)

اس ڈرامے میں ماں جو سربراہ کے بعد دوسرا درجہ رکھتی ہے۔ ایک درزن کے کردار میں سامنے آتی ہے جو سلائی کر کے تھوڑا بہت کما لیتی ہے۔ اس میں پیسے کی طلب نہیں، مگر عزت کی بھوکی ہے اور خوبصورت زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی اولاد بظاہر اس کی فرماں بردار ہے۔ گھر کے اندر اس نے بہت خوبصورت ماحول

بنایا ہوا ہے، مگر شوہر کی ریٹائرمنٹ کے بعد بیٹیوں کو زیادہ محنت کرنے پر اکساتی ہے کہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ گھر میں تو اپنی اولاد پر کڑی نظر رکھتی ہے مگر گھر کے باہر اولاد کیا کرتی ہے کہاں آتی جاتی ہے ۔اس کا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کرتی۔ اسی باعث اس عورت کی زندگی میں غم ختم ہونے کے بجائے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ عورت شوہر کی وفادار کہلائی مگر لڑکیوں کی پرورش میں اس سے چوک ہوگئی۔

"وہ خاتون جو زندگی کے روزگار میں مادرانہ پن مدد کا حصہ ڈالتی ہے۔ تقسیم کار کے لحاظ سے اس کا حصہ کسی اور کے حصے سے کسی طرح کم شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر وہ اپنے بچوں کی زندگی میں دلچسپی بھی رکھتی ہے، اور ان کو اچھا انسان بننے کی تربیت بھی دے رہی ہے۔ اگر وہ ان کی دلچسپیوں میں وسعت پذیری کر رہی ہے، اور انہیں دوسروں سے تعاون کے لیے تیار کر رہی ہے تو اس کا کام اس قدر انمول ہے کہ اس کی اجرت کسی بھی صورت میں ادا نہیں کی جاسکتی۔"(۶۲)

اس ڈرامے کے اہم کردار لڑکیاں ہی ہیں۔ کہانی سحاب، رباب، نورین، ماہین کے گرد گھومتی اور ختم ہو جاتی ہے۔ رباب کا کردار بڑی بیٹی کا ہے۔ یہ لڑکی توجہ اور پیار کی بھوکی ہے۔ جو ڈائجسٹ میں کہانیاں لکھتی اور پیسے کماتی ہے۔ ان پیسوں کو گھر چلانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ اس لڑکی کی سرشت سادہ اور معصوم ہے مگر اپنی بے وقوفی سے لوگوں کے منہ کا نوالہ بن جاتی ہے۔ سحاب کا کردار ایک عام کردار ہے۔

معاشرے میں ایسی لڑکیوں کی بھرمار ہے جو مردوں کے دو میٹھے بول میں آجاتی ہیں۔ اور ان کی توجہ پا کر سب کچھ قربان کر دیتی ہیں۔ لڑکیاں ڈرامائی دنیا میں کھوئی رہتی ہیں۔ جو کسی سلیبریٹی کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھتی ہیں اور اگر وہی سلیبرٹی ان کے سامنے آجائے تو اپنے آپ کو اور اپنی روایات کو فراموش کر کے اس کے تابع ہو جاتی ہیں۔ رباب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس نے جس مصنف کو پڑھا اور دیکھا اسی کو پسند کرنے لگی۔ اس کی ملاقات مجاز صدیقی سے ہوئی جو کہ مصنف اور شاعر تھا۔ اس نے اس ناسمجھ لڑکی کو جھوٹے پیار کے جال میں پھنسالیا۔ اس ناجائز رشتے کی وجہ سے رباب دماغی طور پر پریشان رہتی ہے۔ وہ ماں بننے کی خبر سنتی ہے تو اس کی دنیا لٹ جاتی ہے اور جب مجاز صدیقی اس کے بچے کو ختم کروا دیتا ہے تو اس کی حالت بگڑنے پر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ رباب کا کردار ایک ناسمجھ لڑکی کا کردار ہے۔ جو خواہشوں کو

پورا کرنے کے لیے ہر حد تک جانے کی کوشش کرتی ہے اور اسی حد کو پار کرتے کرتے وہ زندگی ہار جاتی ہے۔ اس کا مجاز صدیقی سے یہ مکالمہ اس کی محبت کو ظاہر کرتا ہے۔

"مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ میں آپ کے ساتھ بیٹھی ہوں۔ آپ جب ہمارے کالج جاتے تھے آپ کو تو یاد بھی نہیں ہو گا میں نے ایک دفعہ آٹو گراف لیا تھا، لڑکیاں تو آپ پر مرتی تھیں۔"(۶۳)

رباب ایسی لڑکی ہے جو غلطی کرنے کے بعد بتانے کا حوصلہ نہیں رکھتی، بلکہ اندر ہی اندر گھلتی چلی جاتی ہے۔ ڈرامے میں نوخیز لڑکیوں کو پروان چڑھتے دکھایا گیا ہے۔ ان کے دل میں محبت کی کلی کھلنے کو منظر پر لایا گیا ہے۔ اردگرد کی صورتحال، گھر کے ماحول کے باعث وقت سے پہلے رباب ذمہ دار ہو گئی ہے۔ اس ڈرامے میں محبت کی تصویر کو ابھارا گیا۔ رباب اس جال میں پھنس کر پچھتاتی ہے، جب وہ اپنا سب کچھ لٹا کر تہی دامن رہ جاتی ہے۔ اور روتے ہوئے یوں کہتی ہے۔

رباب:"سب کچھ کیا ہو گیا؟ کیا کر دیا میں نے۔ ابّا کو تو کبھی منہ نہیں دکھا سکوں گی۔ انہوں نے ہمیں اتنی حفاظت سے رکھا اور میں نے کیا کیا، دل چاہتا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہی ہوں۔ میں ہی نہیں سمجھ سکی آپ کو پتا ہے، مجاز ابّا مجھ پہ سب سے زیادہ بھروسا کرتے۔۔۔۔۔۔۔۔ اور میں نے کیا کیا بہت گندی ہو گئی ہوں نفرت ہے مجھے خود سے۔"(۶۴)

اس جگہ پر رباب کے پچھتاوے، اس کی بے بسی اور ہذیانی کیفیت کو بڑے عمدہ انداز میں دکھایا گیا ہے۔ یاس و نا امیدی اس لڑکی کی زندگی پر چھا جاتی ہے۔ وہ لاحاصل خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہوئے اپنی زندگی قربان کر دیتے ہیں۔ رباب اور سحاب ایک جیسی پسند رکھنے والی، محبت کرنے والی اور خوابوں کے پیچھے بھاگنے والی لڑکیاں ہیں۔ رباب ایک سمجھدار لڑکی ہے جو معاملے کو سمجھتی تو ہے مگر لڑکی جتنی مرضی سمجھدار ہو جائے، شاطر مرد کے فریب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اپنی بہن کو غلط راستوں پر چلنے سے روکتی ہے مگر اسی شخص سے شادی کا بندھن باندھ لیتی ہے جو اس کو غلط راستے پر چلاتا ہے۔ سحاب اپنی بہن کے قاتل سے شادی کر کے خوش نہیں رہتی۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بہن کا قاتل ہی اس کا شوہر ہے تو اس کے پاس پچھتانے

کے علاوہ کچھ نہیں بچتا۔

اس ڈرامے کے یہ دونوں کردار شعوری اور لاشعوری متضاد خواہشات کا مظہر ہیں۔ جڑواں بہنوں کی ایک جیسی عادات اور ایک جیسی پسند کے باعث دونوں ایک ہی مرد کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ ان کی نفسیات ایک جیسی ہی ہے۔ ان کی پسند اور ناپسند ایک جیسی ہی ہے۔ دونوں ایک ہی مرد سے ڈسی جاتی ہیں۔ ان دونوں کے خیالات ایک دوسرے کے بارے میں تب بدلتے ہیں جب دونوں ایک دوسرے کو ایک ہی شخص کی طرف مائل ہوتے دیکھتی ہیں۔ ان دونوں کا انداز ایک دوسرے کے لیے ناصحانہ ہے۔ سحاب کو کچھ کچھ اندازہ ہوتا تو ہے مگر وہ پھر بھی پسندیدہ شخص کی سنگت کے خواب دیکھتی ہوئی، کھائی میں گرتی چلی جاتی ہے۔ سحاب ہر لحاظ سے اپنے آپ کو صحیح گردانتی تھی۔ سحاب کہتی تھی کہ میں اس سے شادی کروں گی اور جائز طریقے سے اپناؤں گی۔ وہ ثابت قدمی سے اپنے فیصلے پر ڈٹی رہتی ہے۔ سحاب شادی کے بعد اضطرابی کیفیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ سحاب کا رویہ بے چینی لیے ہوئے سامنے آتا ہے۔ اس کو کچھ کچھ اندازہ ہوتا تو ہے کہ کہیں نہ کہیں کچھ غلط ضرور ہے۔ سحاب کی لاشعور میں دبی ہوئی خواہشیں حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ سحاب کے یہ الفاظ ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح سے معاشرے میں عورت کی بے وقعتی کو محسوس کرتی ہے۔

"نہیں اب نا دماغ کی کوئی قیمت نہیں، اب اگر قیمت ہے تو اچھی شکلوں کی اور اچھی فیگر کی، بس دیکھنا میں اپنی آواز کے ٹیلنٹ سے کام لوں گی کیوں کروں میں محنت میں راتوں رات سلیبرٹی بنوں گی۔"(۶۵)

سحاب نے جیسی شادی شدہ زندگی کے خواب دیکھے تھے جب اس کی زندگی ویسی نہیں گزرتی تو وہ غمگین ہو جاتی ہے۔ پسند کی شادی کرنے کے باعث وہ اپنے گھر والوں کو اپنی مشکلات نہیں بتاتی۔ سحاب اپنی سوتن سے ملاقات کرتی ہے تو اس کو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس خوبصورتی سے ٹریپ ہو چکی ہے۔ بظاہر خوبصورت، رومانی طبیعت کا مالک نظر آنے والا یہ شخص نجانے کتنی لڑکیوں کی زندگیوں کو برباد کر چکا ہے۔ سحاب نے ہر لحاظ سے اس رشتے کو نبھانے کی کوشش تو کی مگر یہ کوشش اس وقت ناکام ہوتی ہے جب اس کا شوہر خود مجرم ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔ سحاب کی زندگی میں دو طرح کے مرد آتے ہیں، ایک وہ جس نے اسے پا کر گھر کے کونے میں سجا کر رکھ دیا۔ وہ چاہ کر بھی اسے خوشی نہیں دے پایا اور دوسرا وہ جو اسے پا نہیں سکا

مگر ہر مشکل، ہر پریشانی میں اس کے ساتھ کھڑا رہا۔ سحاب کا کردار سمجھدار لڑکی کا کردار ہے۔ جو اپنے فرض کو نبھاتی ہے، تو غلط راہوں کا انتخاب نہیں کرتی بلکہ شرعی طریقے سے اپنی زندگی گزارتی ہے۔ اس کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت اس کی اور اس کے گھر والوں کی عزت کی ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی رشتے کی اہمیت ہے مگر حقیقی رشتہ اسے وہ اعتبار نہیں دے پاتا جس کی وہ خواہش کرتی ہے۔ رشتے کو نبھانے کے لیے وہ سوتیلی ماں بننے کو بھی تیار ہو جاتی ہے۔ جس سے یہ ایک حساس لڑکی ثابت ہوتی ہے۔ شوہر کی سابقہ بیوی اسے اس کے شوہر کا اصل چہرہ دکھانے کی کوشش تو کرتی ہے مگر وہ اسے بھی نظر انداز کر دیتی ہے۔ یہ لڑکی ڈٹ جانے والی، اپنے فیصلوں پر قائم رہنے والی اور ہر طرح کے حالات کا مقابلہ تو کرتی ہے مگر ہمت ختم ہونے پر وہ اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر جاتی ہے۔

سحاب: "ہم لڑکیوں کو نہ ہر کوئی مڈل کلاس کا سمجھ کر چیٹ کرتا ہے پر اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"(٦٦)

"بول میری مچھلی" میں **نورین** کا کردار ایک کالج سٹوڈنٹ کا کردار ہے۔ جو ہر طرح سے پڑھائی میں مصروف رہتی ہے۔ اس کو ورغلانے والا کوئی اور نہیں بلکہ اس کا ہم جماعت لڑکا ہی ہے۔ جس کو شوبز کی دنیا میں نام بنانا ہے۔ وہ اپنا نام بنانے کے لیے اشتہارات سے آغاز کرتا ہے اور نورین کو یہی کہتا ہے کہ اس کام میں بہت پیسہ ہے۔ نورین کمزور کردار کی لڑکی ثابت ہوتی ہے اور اس ڈگر پر چل نکلتی ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ صرف خوبصورتی کو ہی نہیں کر رہی بلکہ اپنی ذات کو بھی نیلام کر رہی ہے۔ وہ پیسوں کے لیے شرائط و ضوابط پر توجہ دیے بغیر ایگریمنٹ پر دستخط کرتی ہے۔ اسے شوبز کی دنیا میں متعارف کروانے والے اس کی قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ بقول شکیل الرحمٰن:

"انسان دنیا میں اپنی بے شمار خواہشوں کو بر لانے کی خاطر جدوجہد کرتا ہے۔ وہ خواہشات کے انبار کے گرد چکر لگاتا ہے اور یہی اس کی رقص کرتی ہوئی زندگی ہے اور بس۔ ان خواہشات میں زیادہ تعداد ان خواہشوں کی ہے جنہیں انسان سماج کی اخلاقی قدروں کی وجہ سے بر نہیں لا سکتا ہے۔ سماجی قدروں اور انسان کی فطرت میں ہمیشہ تصادم ہوتا ہے۔"(٦٧)

ڈراموں کے نسوانی کردار لاشعور کی خواہشات کے پیچھے بھاگنے والے کردار ہیں۔ وہ اپنی لاحاصل خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اپنی زندگی کو برباد کر دیتے ہیں۔ وہ زندگی کی معمولی پریشانیوں کو بڑھا کر وبالِ جان بنا لیتے ہیں۔ اس ڈرامے کی تمام لڑکیاں خوابوں اور خیالوں میں جینے والی لڑکیاں ہیں۔ جن کے نزدیک لاحاصل خوابوں کی تعبیر ضروری ہے۔ نسوانی کردار لاابالی پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کردار اپنی بے وقوفی سے اپنی زندگی برباد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ادب انسان و معاشرے کا مطالعہ ہے اور انسان کو اس کے ذہن میں اترے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔ اس لیے انسانی نفسیات سے آگہی کے بغیر ادب کا خالق ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ لیکن نفسیات کا علم بہت پیچیدہ ہے۔ انسانی ذہن بھول بھلیوں کی مانند ہیں کہ اس میں اترنے کے بعد کبھی راستا ملتا ہے، کبھی نہیں ملتا۔ جو انسان جتنا حساس، جتنا وسیع المطالعہ اور مختلف تجربات کا حامل ہو گا اس کا ذہن اتنا ہی زیادہ پر پیچ ہو گا۔ ایک اچھے فنکار میں یہ تینوں چیزیں موجود ہوتی ہیں اس لیے اس کی ذہنی پیچیدگیوں کو سمجھنا زیادہ دشوار ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شکیل الرحمٰن، ادب اور نفسیات، اشاعت گھر پٹنہ، ۱۹۵۱ء، ص:۵۵

۲۔ شمشاد حسین، پروفیسر، مترجم، ذکیہ مشہدی، انسانی کردار: ایک نفسیاتی اور معاشرتی تجزیہ، انجمنِ ترقی خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص:۲۲

3. Jung c.g contribution to analytical psychology, London, Routledge and Kegan paul,1947, p:243

۴۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، سرئیلزم: خواب اور حقیقت کا سنگم، مشمولہ ماہِ نو، کراچی، اپریل، ۱۹۶۰ء، ص:۲۹

۵۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از صبا وحید، لاہور، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت: شام، ۵ بجے

۶۔ کریم اللغات، مکتبہ اسلامیہ، ملتان، ۲۰۱۴ء، ص:۱۱۰

۷۔ حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، اشاعتِ اوّل، مئی ۲۰۱۵ء، ص:۳۸۸

۸. Lterrature: An introduction to fiction, poetry, and Drama, sixth ed, Harper Collins college publishers,1995,P:68

۹۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، خدا زمیں سے گیا نہیں ہے مورخہ، ۱۴ اکتوبر، ۲۰۱۸ء، بوقت ۴ بجے، قسط:۲، منظر:۱، ایکٹ:۲

۱۰۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، خدا زمیں سے گیا نہیں ہے مورخہ، ۱۴ اکتوبر، ۲۰۱۸ء، قسط: ۱، منظر:۲، ایکٹ:۱

۱۱۔ ایضاً قسط:۱، منظر:۵، ایکٹ ۱

۱۲۔ شمشاد حسین، پروفیسر، مترجم، ذکیہ مشہدی، انسانی کردار: ایک نفسیاتی اور معاشرتی تجزیہ، انجمنِ ترقی خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص:۲۹

۱۳۔ ایضا، ص:۵۴

۱۴۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، خدا زمیں سے گیا نہیں ہے مورخہ، ۱۴ اکتوبر، ۲۰۱۸ء، قسط: ۲، منظر:۲، ایکٹ:۱

۱۵۔ ایضاً، قسط:۲، منظر:۳، ایکٹ:۱

۱۶۔ شمشاد حسین، پروفیسر، مترجم، ذکیہ مشہدی، انسانی کردار: ایک نفسیاتی اور معاشرتی تجزیہ، انجمنِ ترقی خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص:۲۳

۱۷۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، خدا زمیں سے گیا نہیں ہے مورخہ، ۱۴ اکتوبر، ۲۰۱۸ء، قسط: ۱۵، منظر:۴، ایکٹ:۱

۱۸۔ ایضاً، قسط:۱۶، منظر:۳، ایکٹ:۵

۱۹۔ ایضاً، قسط:۱۶، منظر: آخری منظر، ایکٹ:۵

۲۰۔ ایضاً، قسط:۱۳، منظر:۵، ایکٹ:۴

۲۱۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، تم ہو کہ چپ، مورخہ ۱۲ جون ۲۰۱۸ء،، قسط:۶، منظر:۷، ایکٹ:۲

۲۲۔ شمشاد حسین، پروفیسر، مترجم، ذکیہ مشہدی، انسانی کردار: ایک نفسیاتی اور معاشرتی تجزیہ، انجمنِ ترقی خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص:۱۵۱

۲۳۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، تم ہو کہ چپ، مورخہ ۱۲ جون ۲۰۱۸ء، قسط:۱، منظر:۱، ایکٹ:۱

۲۴۔ ایضاً، قسط:۳، منظر:۴، ایکٹ:۲

۲۵۔ ایضاً، قسط:۳، منظر:۵، ایکٹ:۲

۲۶۔ شمشاد حسین، پروفیسر، مترجم، ذکیہ مشہدی، انسانی کردار: ایک نفسیاتی اور معاشرتی تجزیہ، انجمنِ ترقی خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص:۹۰

۲۷۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، بول میری مچھلی، مورخہ ۱۰، نومبر ۲۰۱۸ء، قسط:۲۸، منظر:۲، ایکٹ:۵

۲۸۔ ایضاً، قسط:۱۷، منظر:۱۰، ایکٹ:۳

۲۹۔ ایضاً، قسط:۱۸، منظر:۱۰، ایکٹ:۳

۳۰۔ ایضاً، قسط:۲، منظر:۳، ایکٹ:۱

۳۱۔ ایضاً، قسط:۷، منظر:۴، ایکٹ:۲

۳۲۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، دل تو بھٹکے گا مورخہ ۱۰، جولائی ۲۰۱۸ء، قسط:۶، منظر:۳، ایکٹ:۳

۳۳۔ ایضاً، قسط:۱۱، منظر:۲، ایکٹ:۴

۳۴۔ شمشاد حسین، پروفیسر، مترجم، ذکیہ مشہدی، انسانی کردار: ایک نفسیاتی اور معاشرتی تجزیہ، انجمنِ ترقی خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص:۷۸

۳۵۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، دل تو بھٹکے گا مورخہ ۱۰، جولائی ۲۰۱۸ء، قسط:۲، منظر:۱۲ ایکٹ:۱

۳۶۔ شمشاد حسین، پروفیسر، مترجم، ذکیہ مشہدی، انسانی کردار: ایک نفسیاتی اور معاشرتی تجزیہ، انجمنِ ت رقی خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص:۲۹

۳۷۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، دل تو بھٹکے گا، مورخہ ۱۰، جولائی ۲۰۱۸ء، قسط:۳، منظر:۸ ایکٹ:۲

۳۸۔ ایضاً، قسط:۹، منظر:۵، ایکٹ:۴

۳۹۔ ایضاً، قسط:۱۴، منظر:۳، ایکٹ:۵

۴۰۔ شمشاد حسین، پروفیسر، مترجم، ذکیہ مشہدی، انسانی کردار: ایک نفسیاتی اور معاشرتی تجزیہ، انجمنِ ترقی خدا بخش لائبریری، پٹنہ ۲۰۰۰، ص:۱۹

۴۱۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، خدا زمیں سے گیا نہیں ہے مورخہ، ۱۴دسمبر، ۲۰۱۸ء، قسط: ۵، منظر:۱۱، ایکٹ:۳

۴۲۔ ایضاً، قسط:۵، منظر:۸، ایکٹ:۳

۴۳۔ ایضاً، قسط:۱۵، منظر:۳، ایکٹ:۵

۴۴۔ ایضاً، قسط:۱۱، منظر:۳، ایکٹ:۴

۴۵۔ ایضاً، قسط:۳، منظر:۱، ایکٹ:۲

۴۶۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، تم ہو کہ چپ، مورخہ ۱۲جون۲۰۱۸ء، بوقت، قسط:۱، منظر:۳، ایکٹ:۱

۴۷۔ ایضاً، قسط:۵، منظر:۹، ایکٹ:۲

۴۸۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو، از صبا وحید، لاہور، ۱۲نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت ۵ بجے

۴۹۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ تم ہو کہ چپ، مورخہ ۲۲جون۲۰۱۸ء، قسط:۲، منظر:۳، ایکٹ:۱

۵۰۔ ایضاً، قسط:۵، منظر:۳، ایکٹ:۲

۵۱۔ ایضاً، قسط:۹، منظر:۹، ایکٹ:۳

۵۲۔ ایضاً، قسط:۱۱، منظر:۱۲، ایکٹ:۳

۵۳۔ ایضاً، قسط:۱۸، منظر:۴، ایکٹ:۵

۵۴۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، دل تو بھٹکے گا مورخہ، ۱۰، جولائی، ۲۰۱۸ء، قسط:۷، منظر:۳، ایکٹ:۳

۵۵۔ ایضاً، قسط:۱۳، منظر:۲، ایکٹ:۴

۵۶۔ ایضاً، قسط:۱۵، منظر:۴، ایکٹ:۵

۵۷۔ ایضاً، قسط:۱۵، منظر:۱۰، ایکٹ:۵

۵۸۔ ایضاً، قسط:۱۵، منظر:۱۱، ایکٹ:۵

۵۹۔ ایضاً، قسط:۱۵، منظر:۵، ایکٹ:۵

۶۰۔ شمشاد حسین، پروفیسر، مترجم، ذکیہ مشہدی، انسانی کردار: ایک نفسیاتی اور معاشرتی تجزیہ، انجمنِ ترقی خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص:۱۲۰

۶۱۔ ایضاً، ص:۱۲۰

۶۲۔ ایضاً، ص:۱۸

۶۳۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، بول میری مچھلی، مورخہ، ۱۰، نومبر، ۲۰۱۸ء، قسط:۱، منظر:۴، ایکٹ:۱

۶۴۔ ایضاً، قسط:۳، منظر:۲، ایکٹ:۲

۶۵۔ ایضاً، قسط:۶، منظر:۵، ایکٹ:۳

۶۶۔ ایضاً، قسط:۶، منظر:۵، ایکٹ:۳

۶۷۔ شکیل الرحمٰن، ادب اور نفسیات، اشاعت گھر پٹنہ، ۱۹۵۱ء، ص:۵۴۔۵۳

باب چہارم:

اصغر ندیم سید کے کرداروں میں عائلی زندگی ایک مطالعہ

الف۔عائلی زندگی

اللہ پاک نے ہر جاندار کا جوڑا بنایا اور نسل انسانی کو پروان چڑھایا۔انسان باقی جانداروں کی نسبت منظم انداز میں زندگی کے سفر پر گامزن نظر آتا ہے۔انسان کی عائلی زندگی ہر طرح سے اہمیت کی حامل ہے۔لفظ "عائلہ" عربی زبان کا لفظ ہے جس سے مراد گھر کے لوگ ہیں۔اردو لغت میں عائلی سے زیادہ عیال کا لفظ ملتا ہے۔عائلہ اور عائلی دونوں ایک ہی معنی دیتے ہیں۔

> "عائلہ: خاندان، کنبہ ، گروپ، دور اول میں انسان بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔اس لیے عورت مطلق اور بالکل آزاد تھی پھر آئین کی تشکیل ہوئی عورت کے لیے یہ دوسرا دور تھا۔"(۱)

عائلی سے مراد خاندان سے متعلق،خاندانی اور نسلی وغیرہ ہے۔علمِ عمرانیات میں خاندان کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ

> "خاندان ایک بنیادی اور اہم سماجی ادارہ ہے۔جو دو یا دو سے زیادہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے ۔ جن کا بنیادی مقصد بچے پیدا کرنا اور ان کی اس طرح پرورش کرنا ہے کہ معاشرے کا کار آمد رکن بن سکیں"(۲)

خاندان ایک اجتماعی گروہ کا نام ہے۔جس کا مقصد لوگوں کی روحانی،جسمانی اور ذہنی سلامتی کو برقرار رکھنا ہے۔یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان اپنی زندگی بسر کرنے کی لیے معاشرتی تعلقات کا محتاج ہے۔انسان کو اپنے وجود، پرورش، تعلیم ، صحت الغرض زندگی کے تمام معاملات میں قدم بقدم اس کی ضرورت رہتی ہے۔انسان بطور سماجی رکن اپنے وجود کے فوراًبعد جس معاشرتی ادارے کا محتاج ہوتا ہے،وہ

ادارہ **"خاندان"** کہلاتا ہے۔یہی وہ ادارہ ہوتا ہے جو انسان کی جسمانی، روحانی، اخلاقی اور فکری پرورش کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس ادارے میں زندگی گزارنے کے طور طریقوں کو عائلی نظام زندگی کہا جاتا ہے۔ عائلی زندگی ہی انسانی شخصیت کی پہلی بنیاد رکھتی ہے۔ عائلی زندگی کی بنیادی اکائی کی حیثیت میاں بیوی کو حاصل ہے، انہی کے ازدواجی تعلقات سے اس زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ انگریزی زبان میں عائلی کے لیے "Family" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے:

"Family: member of household parents' children etc.; Set of parents and children or a relation, whether living together or not person's children."(۳)

خاندان کی اقسام:

علم عمرانیات میں خاندان کی تقسیم بندی کی گئی ہے۔ ساخت کے اعتبار سے خاندان کی دو قسمیں ہیں:

i۔ مشترکہ خاندان(Joint Family)

مشترکہ خاندان سے مراد ایسا عائلی نظام زندگی ہے جو شوہر، بیوی ، والدین اور چند دوسرے رشتہ داوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض اوقات دو، دو اور تین تین نسلیں ایک ساتھ رہتی ہیں۔ خاندان کے افراد کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ گھر کا سب سے بزرگ مرد گھر کا سربراہ ہوتا ہے، برصغیر پاک وہند میں زیادہ تر یہی عائلی نظام رائج ہے۔

ii۔ سادہ خاندان:(Nuclear Family)

سادہ خاندان سے مراد وہ عائلی نظام زندگی ہے جو صرف شوہر، بیوی اور ان کے ایسے بچوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنی کفالت خود نہ کر سکیں۔ اس میں خاندان کے افراد کی تعداد کم ہوتی ہے اور جدت پسندی کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ مغربی ممالک سمیت ایران میں زیادہ تر یہی خاندانی نظام رائج ہے۔

اقتدار و اختیار کے اعتبار سے خاندان کی تین اقسام ہیں؛ پدر سری خاندان، مادر سری خاندان اور جمہوری خاندان

۱۔ پدر سری خاندان(Patriarchal Family)

خاندان کی وہ قسم جس میں گھر کا سربراہ مرد ہوتا ہے اگرچہ عورت کے حقوق بھی معین ہوتے ہیں مگر گھریلو فیصلے اور دیگر بڑے معاملات میں فیصلے کا اختیار مرد کو ہوتا ہے۔

۲۔مادر سری خاندان(Matriarchal Family)

خاندان کی وہ قسم جس میں گھر کا سربراہ عورت ہوتی ہے اور بڑے فیصلے خاتون ہی کرتی ہے۔ زرعی زندگی کے آغاز میں یہ نظام رائج تھا، وقت گزرنے کے ساتھ اب یہ نظام معدوم ہو گیا ہے۔

۳۔ جمہوری خاندان(Democratic Family)

خاندان کی وہ قسم جس میں شوہر اور بیوی متفقہ طور پر خاندانی امور طے کرتے ہیں۔ عورت، مرد کا ہر معاملے میں جسمانی، ذہنی، معاشی اور تعلیمی لحاظ سے ساتھ دیتی ہے۔ آج کل معاشروں میں زیادہ تر یہی خاندانی نظام رائج ہے۔

یہ بات انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ اپنی ایک سماجی شناخت چاہتا ہے اور اس فطرت کو پروان چڑھانے کا ابتدائی کام عائلی نظام زندگی انجام دیتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ انسان سب سے زیادہ گھر میں اپنائیت محسوس کرتا ہے۔اپنائیت کا یہی احساس بعد میں اس کی شخصیت بنانے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ انہی خصوصیات کی بنا پر خاندان کو بحیثیت ادارہ معاشرے کے دیگر تمام اداروں میں ایک اہم اور مرکزی مقام حاصل ہے۔ آج کل جن بچوں کو کم عمری میں ہاسٹلز میں بھیج دیتے ہیں ان کی شخصیت کی مناسب تعمیر سازی نہیں ہوتی، گھر کے باہر افرادِ خانہ کی محبت اور شفقت نہیں مل سکتی۔اس محبت کا کوئی نعم البدل نہیں یہی وجہ ہے کہ یہی بچے بعد میں جاکر معاشرے کی تعمیر و تنظیم میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور سماج میں ان کے رویے قابلِ قبول نہیں ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات بچے اپنے والدین کو بھی اذیت پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے۔لہذا سماج کو یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ بچوں کو کم عمری میں جس پیار و محبت اور شفقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف اور صرف عائلی نظام زندگی ہی فراہم کر سکتی ہے۔ انسان کی فکری، جسمانی، اخلاقی، روحانی اور نفسیاتی تعمیر سازی حقیقی معنوں میں صرف عائلی نظام زندگی سے ہی ممکن ہے۔ دینِ کامل

اسلام نے جہاں زندگی کے دیگر امور کی طرف رہنمائی کی ہے وہاں عائلی نظام زندگی کے بارے میں بھی ایک جامع نظام دیا ہے۔ اسلام نے عائلی زندگی میں ہر رکن کے حقوق اور ذمہ داریاں واضح کر کے بیان کی ہے اور ان پر عمل کرنے کی صورت میں پر سکون اور خوش گوار خاندان سامنے آتا ہے۔ ایسا نظام ہی معاشرے کو قیمتی گوہر دے سکتا ہے۔ شادی سے پہلے اور بعد کے مراحل سے لے کر میاں بیوی کے حقوق، اولاد کے حقوق، والدین کے حقوق حتٰی کہ ہمسائے کے حقوق اس طرح پیش کیے گیے ہیں کہ ان پر عمل امن اور پر سکون معاشرے کی ضمانت دیتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ عائلی نظام زندگی کے دو اہم پہیے میاں اور بیوی ہیں۔ اس نظام کو کامیاب بنانے یا بگاڑنے میں اصل کردار میاں بیوی کا ہی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے خدائے بابرکت نے فطرتاً مرد اور عورت کی تخلیق ہی کچھ اس طرح سے کی ہے جس طرح ایک خاندانی نظام زندگی کی ضرورت ہے۔ علامہ عبد الحمید المہاجر اپنی کتاب " اعلموانی فاطمہ " میں اسی فطرتی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> " ایک خاندانی نظام زندگی کی تعمیر و تنظیم کے لیے جہاں محبت و شفقت اور عطوفت کی ضرورت ہے وہاں مضبوط ارادوں اور دقیق فیصلوں کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند متعال نے عورت کی فطرت میں حساسیت اور شفقت و عطوفت کا پہلو مرد کی نسبت زیادہ رکھا ہے تو مرد میں سخت حالات میں بھی جذباتیت پر کنٹرول کر کے دقیق فیصلے کرنے کی طاقت عورت کی بہ نسبت زیادہ رکھ دی ہے۔ "(۴)

ڈراما نگار کا ماننا ہے کہ آج کل معاشرے میں افراد کو درپیش مسائل ڈراموں میں پیش نہیں ہو رہے۔ ان ڈراموں کا مزاج کمرشل ہے اور یہ محدود طبقے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ڈراما نگاروں نے اپنے معاشرتی موضوعات کو محدود کر لیا۔ اس میں لڑکی کے رشتے کو ہی موضوع بنایا جاتا ہے۔ جب کہ آج کل کی لڑکیوں کا مسئلہ رشتہ نہیں تعلیم اور ملازمت ہے۔

بقول اصغر ندیم سیّد:

> " عائلی زندگی میں لڑکیوں کے مسائل، ان کی تعلیم و تربیت، عورتوں کی معاشی اور فکری آزادی، خواتین کے حقوق، معاشرتی ناانصافی، طبقاتی فرق کے نتیجے میں کمزور

طبقوں کے استحصال کے خلاف مردانہ معاشرے کے مختلف خدوخال میرے ڈراموں
کے موضوعات رہے ہیں۔"(۵)

ب۔ اصغر ندیم سید کے کرداروں میں عائلی زندگی ایک مطالعہ

"خدا زمین سے گیا نہیں ہے"

عائلی زندگی سے مراد افراد خانہ، شوہر اور بیوی کی ازدواجی زندگی ہے۔ ان کے تعلقات اور اولاد عائلی زندگی کے بنیادی عناصر ہیں۔ عائلی زندگی کی تشریح و توضیح کے بعد منتخب کردہ ڈراموں کے کرداروں کو عائلی زندگی کے تناظر میں پرکھا گیا ہے۔ "خدا زمین سے گیا نہیں ہے" کا موضوع چونکہ دہشتگردی ہے۔ اس لیے گھر کے ماحول اور افرادِ خانہ کے رویوں کو اس تناظر میں پرکھنا قدرے مشکل ہے۔ ان کرداروں میں بے چینی، مایوسی اور نااُمیدی پائی جاتی ہے۔ اس ڈرامے میں دو خاندانوں کے الگ الگ رویے اور انداز و اطوار پیش کیے گئے ہیں۔ اسی باعث اس ڈرامے میں دو قسم کے خاندان نظر آتے ہیں۔ ایک پدرسری خاندان اور دوسرا جمہوری خاندان۔ خاندان کے افراد کی سوچ اور افکار بڑے عمدہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ کیسے ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھنے والی، ایک ہی باپ کی اولاد جدا ہو کر مختلف راہوں پر گامزن ہو گئی، اور ان کے ناپختہ ذہنوں پر ماحول نے کیسے اثر ڈالا ہے۔ ان دو بھائیوں نے کیسے اپنے گھر کا نظام چلایا۔ خائستہ گل اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ جو کہانی کا ولن ہے اور اس کے گھر کا ماحول دوسرے بھائی کے گھر سے الگ ہے۔

خائستہ گل کی شخصیت پر اس کی بلوغت کے حادثات نے بہت بُرا اثر ڈالا اور یہ اثر اس پر تاعمر قائم رہا۔ خائستہ گل کی سوچ اپنے باپ اور ماں کی ازدواجی زندگی نے بھی بدلی ہے۔ نیز اس کے گھر کے ماحول کی اس کی سوچ اور اس کے دماغ پر گہری چھاپ موجود ہے۔ اس نے تہیہ کیا کہ اگر میری ماں زندہ نہیں رہی تو میں کسی اور کو بھی زندہ نہیں رہنے دوں گا۔ خائستہ گل کا کردار ایک لاابالی کردار ہے۔ اس کے رویے کی وجہ سے اس کی ازواجی زندگی بھی متاثر ہوئی ہے۔ اس کی زندگی کا تجزیہ کرنے سے پہلے قبائلی علاقوں کی فرسودہ روایات رسوم کا ذکر کرنا اور وہاں کے ماحول کا تجزیہ کرنا بہت ضروری ہے۔ قبائلی علاقوں میں عورت کو حق مہر ادا کر کے نکاح نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے باپ یا بھائی کو ادا کر کے نکاح کیا جاتا ہے۔ اسلام میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت تو

ہے مگر ساتھ ہی بیوی کے حقوق ادا کرنا بھی فرض ہے۔ قبائلی علاقہ جات میں چار سے زائد شادیاں کرنا حق سمجھا جاتا ہے۔ نیز ہر نئی آنے والی دلہن کو جانور سمجھ کر تشدد کرنا فرض قرار دیا جاتا ہے۔ عورت کو باندی بنانے کا رواج عام ہے۔ اسی طرح کی صورتِ حال کی عکاسی اس ڈرامے میں بھی کی گئی ہے۔

خائستہ گل کا کردار اس ڈرامے میں ایک منفی کردار ہے۔ جو اپنے منفی رویوں کے باعث پورے ڈرامے پر چھایا ہوا ہے۔ خائستہ گل نے قرآن و حدیث کی تشریح و توضیح اپنی پسند اور منشا کے مطابق کرلی اور اپنی پسند کے اصول و قواعد دوسروں پر لاگو کر دیے ہیں۔ وہ اسلام کے حقیقی اصول حقوق العباد کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ اس کی نظر میں بیوی کی کوئی اہمیت نہیں ہے بس اسے ضرورت کے وقت بلایا جاتا ہے۔ گھر کے کام کاج تو کرتی ہے مگر اس کی اہمیت گھر کے غلام سے زیادہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے خائستہ گل اور رحمٰن گل کے والدین کے جو حالات دکھائے گئے ہیں وہ بھی قابل توجہ ہیں۔ ان حالات نے خائستہ گل اور رحمٰن گل دونوں پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ خائستہ گل اور حمان گل کی ماں تڑپ تڑپ کر مر جاتی ہے مگر اس کا باپ بضد ہے کہ ہمارے یہاں کی عورتیں غیر مردوں سے علاج نہیں کرواتیں۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے مگر خائستہ گل کے دماغ پر بہت گہرا اثر ڈال جاتی ہے۔ اس سے خائستہ گل کے دماغ کی طنابیں رخ موڑ لیتی ہیں۔ خائستہ گل اپنی بیویوں سے ویسا ہی سلوک کرتا ہے جیسا اس کے باپ نے روا رکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں عورت کو جب مرد خرید کے لے آئے تو جیسا مرضی سلوک روا رکھے، وہ اس کی ملکیت ہوتی ہے۔ خائستہ گل اپنے لیے جو تیسری بیوی خرید کر لاتا ہے وہ اس کی بیٹی کی عمر کی ہوتی ہے، اور ویسی ہی خوبصورت مگر بدقسمتی سے اس کے باپ نے اسے چند روپوں کی خاطر نکاح کے بندھن میں باندھ کر خائستہ گل کے ساتھ روانہ کر دیا ہے۔ آج بھی ایسے قبائلی علاقے موجود ہیں جہاں غربت انتہا کی ہے۔ وہ اپنی بیٹیوں کو چند روپوں کی خاطر نکاح کر کے رخصت کر دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ گناہ نہیں بلکہ ایک فرض کی ادائیگی ہے۔ جو وہ احسن طریقے سے سرانجام دے دیتے ہیں۔

خائستہ گل اپنی پہلی بیویوں کے ساتھ بھی نہایت برا سلوک کرتا ہے اور جب تیسری بیوی لے کر آتا ہے اس کو بھی ڈرا دھمکا کر رکھتا ہے۔ اس کی نظر میں بیوی کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ وہ صرف زر خرید لونڈی کی حیثیت سے گھر میں رہ رہی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کا ہر حکم بجالائے جبکہ شوہر اس کو دو وقت کی

روٹی دے کر شوہر انہ حقوق پورے کر دیتا ہے ۔ خائستہ گل کا بیٹا اپنی سوتیلی ماں کو ماں نہیں سمجھتا بلکہ اس کی تذلیل کرتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ زرگل سوتیلی ماں کی عزت نہیں کرتا ہے۔ خائستہ گل اور زرگل کا یہ مکالمہ علاقے کی پست سوچ اور فرسودہ روایت کو ظاہر کرتا ہے۔

"خائستہ گل : کیا بات ہے زرگل تم گھر کے اندر فساد کیوں پیدا کرتا ہے ۔ فساد خدا تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔

زرگل : بابا! فساد خدا تعالیٰ کو پسند نہیں ہے اور کچھ لوگ ہر وقت فساد کرواتا ہے۔ بولتا کچھ ہے کرتا کچھ ہے۔

خائستہ گل : بہت باریک ، بہت باریک فرق ہوتا کفر اور ایمان میں سچ اور جھوٹ میں عزت اور ذلت میں توبہ کرو! توبہ !

زرگل : ایک بات بتائیں بابا یہاں بے روزگاری ہے، ظلم ہے ، غربت ہے ، تم اپنا جنگ لڑتا ان لوگوں کے لیے کیوں نہیں کچھ کرتا۔

خائستہ گل : ہم سمجھ گیا تمھاری بات تم کو یہاں کے لوگوں کا کوئی فکر نہیں ہے تم کو اپنا فکر ہے۔ اپنا تم کو شادی کا شوق ہے بچے، ہم سے پیسہ لو جاؤ جلال آباد اپنے لیے لڑکی پسند کرو لے آؤ۔ جیسے ہم اس کو لے کر آیا ہے۔"(۶)

نکاح کا مقصد محض جنسی جذبے کی تسکین نہیں بلکہ ان تمام ذمہ داریوں کا پورا کرنا ہے جو نکاح سے عائد ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لیے "نکاح" کرتا ہے، اور ان ذمہ داریوں کی پروا نہیں کرتا جو نکاح کی رُو سے عائد ہوتی ہیں تو قرآن کریم کی رُو سے وہ حقیقی معنوں میں نکاح نہیں ہوتا۔ اس نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ "مُحۡصِنِيۡنَ" کے معنی ہیں، حدود و قیود کے اندر رہنے کے لیے۔ اور مسافحین سے مراد ہے محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لیے۔

نکاح سے مراد دونوں پر یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے: وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِي عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوفِ (۲:۲۲۸) قاعدے اور قانون کے مطابق ، عورت کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی اس کی ذمہ داریاں ہیں۔

میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہونے چاہئیں کہ اس سے گھر میں کامل سکون اور اطمینان پیدا ہو۔ قرآنِ کریم کی رُو سے "ازدواج" (جوڑوں) کا مطلب ہی ہے کہ لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا (۳۰:۲۱) ان سے تسکین حاصل ہو، اور باہمی محبت اور رفاقت پیدا ہو۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (۳۰:۲۱) ایسے گھر کو خدا، جنت سے تعبیر کرتا ہے (۲:۲۲۱) کے برعکس، جن میاں بیوی میں ہم آہنگی خیالات نہ ہو، ان کے گھر کو وہ جہنم کہہ کر پکارتا ہے (۲:۲۲۱)

حالیہ نافذ کردہ عائلی قوانین کی رُو سے نابالغ لڑکی یا لڑکے کے نکاح کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے اور یہ قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ علما حضرات اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لیے اسے ضبطِ تحریر میں لے آنا اور سرکاری ریکارڈ میں درج کرا دینا ہی بہتر ہے۔ اس سے مستقبل میں پیدا ہونے والے بہت سے جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے تو باہمی لین دین کے معاملات کو بھی تحریر میں لانے کی سخت تاکید کی ہے (۲:۲۸۲)۔ نکاح کا معاہدہ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ چونکہ ازدواجی میزان میں، عوت کا پلڑہ، بمقابلہ مرد کے جھکتا ہے (یعنی عورت کی قدر و قیمت مرد کے مقابلہ میں زیادہ ہے) اس لیے مرد کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ کچھ تحفہ عورت کو دے۔ اسے مہر کہا جاتا ہے۔ یہ مہر کسی بات کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر بطور تحفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے قرآن کریم نے نِحْلَةً کا لفظ استعمال کیا ہے (۴:۴) جس کے معنی ہیں "بلا بدل" قرآن نے مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ جو کچھ بھی باہمی رضامندی سے طے ہو جائے وہ مہر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے، اس لیے اسے علیٰ قدرِ وسعت ہونا چاہئے۔ طلاق کے معنی ہیں۔ "نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا"۔ چونکہ یہ معاہدہ فریقین (مرد اور عورت) نے باہمی رضامندی سے استوار کیا تھا اس لیے ان میں سے کسی ایک کو اس کا حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ جب جی چاہے، اپنی مرضی سے اس معاہدہ کو منسوخ کر دے۔ اس میں دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا بلکہ معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ سورۃ النسا میں ہے:۔ اگر تم کسی میاں بیوی میں باہمی اختلاف، جھگڑے یا مخالفت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو، تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ، جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائے۔

اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید کی جاسکتی ہے کہ میاں بیوی میں موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔(۴:۳۵)

اس خاندان میں عورت ذات کو کم تر حیثیت حاصل ہے جبکہ مرد حاکم اور عورت محکوم ہے۔ وہ ہر طرح سے عائلی زندگی کے اصولوں کو فراموش کرتا ہوا، زندگی گزارتا چلا جاتا ہے۔ اس علاقے میں عورت کی زندگی ایک بے بس اور لاچار انسان کی زندگی ہے۔ جو زندگی جی نہیں رہی بلکہ گزار رہی ہے اور موت کے انتظار میں بیٹھی ہوئی سسکتی رہتی ہے۔ فیروزہ اور پلوشہ کے مکالمے اس بے بسی کی تصویر پیش کرتے ہیں، جب فیروزہ اپنی کم مائیگی پر روتی ہے اور پلوشہ کو کہتی ہے کہ تم ہم سے بات کیوں نہیں کرتی تو پلوشہ اس کو ماں ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کے یہ الفاظ اس کا درد ہم پر واضح کرتے ہیں۔

"فیروزہ: تم ٹھیک کہتا ہے ہم تمہارا ماں نہیں ہے قسمت برا تھا کہ ہم یہاں آ گئے۔ کسی نے ہم سے یہ پوچھا کہ ہمارا نکاح ہماری مرضی سے ہوا ہے کہ نہیں؟ نہیں پلوشے خدا کی قسم! ہمارا نکاح ہماری مرضی سے نہیں ہوا اس مولوی نے پیسے لیے۔

پلوشہ: تو ہمارا بابا تم کو خرید کر لایا تھا۔

فیروزہ: ہاں۔"(۷)

خائستہ گل کی اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی شامل ہے۔ بیٹا باپ کے نقشِ قدم پر چلتا ہ جب کہ بیٹی باپ کے فیصلوں سے خوش نہیں ہے اور اس کی مخالفت کرتی ہے۔ اسی باعث وہ باپ اور بھائی کے رویوں سے تنگ آ کر باپ کے ساتھ نہ جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ خائستہ گل اپنی تیسری بیوی کو الزام دیتا ہے اور اسے جانوروں کی طرح مارتا پیٹتا ہے۔ خائستہ گل کی بیوی فیروزہ پردے میں رہتی ہے۔ گھر کا ماحول خالص دیسی ماحول ہے۔ گھر میں سامانِ ضرورت بہت کم ہے۔ یہ لوگ مہاجر ہیں۔ جب فوج ان کو ڈھونڈتے ہوئے ان تک پہنچ جاتی ہے تو یہ لوگ جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ ان کے گھر کا رات کا منظر اور مکالمے ان کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ خائستہ گل اپنی جوان بیوی فیروزہ سے مخاطب ہوتا ہے۔

"خائستہ گل: تم ہم سے پردہ کیوں کرتا ہے

فیروزہ: پلوشہ گھر میں ہوتا ہے ہم اس کے سامنے نہیں آسکتا ہے۔

خائستہ گل: اے مگر تم تو ہمارا بیوی ہے۔ بیوی تو اپنے مرد کا کھیتی ہوتا اے

فیروزہ: پلوشہ بڑی ہو گئی سمجھدار ہو گئی، اس کی شادی کیوں نہیں کرتا

خائستہ گل: کرے گا اس کا بھی شادی کرے گا پہلے ام کو سوچنے دیو۔

فیروزہ: فیصلہ تو باپ کا ہوتا وہ معصوم تو نہیں بول سکتا اے۔ آپ اس کا فیصلہ کرو۔

خائستہ گل: تم بھی تو اس کا ماں اے تمہارا بھی تو فرض بنتا۔

فیروزہ: زر گل بہت غصے میں رہتا ہے اس کا بھی شادی کرو۔

خائستہ گل: او چھوڑو اس کو پہلا حکم لڑکی کا ہے۔ پہلے پلوشہ کا شادی ہوئے گا۔۔۔ لیکن تم ہم سے پردہ نہیں کرے گا۔

فیروزہ: میری ماں بھی بابا سے پردہ کرتی تھی۔"(۸)

اس گھرانے کا ماحول نہایت سادہ ہے۔ پلوشہ جیسی معصوم سادہ طبیعت لڑکی اس گھرانے میں موجود ہے جس میں کسی قسم کی چالاکی نہیں ہے فیروزہ جو اس کی ماں بن کر آئی ہے اسی کی عمر کی ہے۔ باپ کا حکم حرف آخر ہے، باپ گھر کے فیصلے کرتا ہے، کھانے کو دیتا ہے، ضروریات زندگی پورا کرتا ہے۔ اس گھر کے افراد کی ضروریات زندگی نہایت سادہ عام اور بہت محدود ہیں، کیونکہ یہ لوگ مہاجر ہیں اور ایک جگہ ٹک کر رہنے کے بجائے ادھر سے ادھر ہجرت کرتے ہیں۔ کیونکہ خائستہ گل دہشتگردوں کے ساتھ کام کرتا ہے اس لیے فوج کے ڈر سے اپنے اہل خانہ کو بھی ادھر سے ادھر منتقل کرتا رہتا ہے۔ باپ بیٹی سے پوچھے بغیر اس کی شادی کا فیصلہ کرتا ہے، اور اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے۔ گھر کا ماحول ایک ہیجان کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔ جس میں غصہ بھی ہے، مایوسی بھی ہے اور حکم بھی ہے۔ مایوسی عورت کی ہے غصہ اور حکم مرد کا ہے۔ اس آمیزش سے اس گھر کا ماحول نہایت دکھ اور غم کی کیفیت میں نظر آتا ہے۔

رحمان گل کا کردار اس ڈرامے میں ایک مثبت کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ رحمان گل بہت زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے اور شہر کے گنجان آباد علاقے میں اس کی ڈرائی فروٹ کی دکان ہے۔ وہ اپنے مثبت خیالات کے باعث عمدہ کردار بن جاتا ہے۔ رحمان گل پر اپنے باپ اور بچپن کے حالات کا گہرا اثر تو ہوا مگر اس کا کہنا یہی تھا کہ میں لوگوں کی مدد کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ جیسے حالات سے میں گزرا ہوں ویسے حالات سے میں کسی اور کو گزرنے نہیں دوں گا۔ اس پر اس کی ماں کی موت مثبت انداز سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی باعث

وہ شہر جانے کو ترجیح دیتا ہے۔ شہر جا کر وہ خود تو تعلیم حاصل نہ کر سکا مگر وہ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم ضرور دلوا دیتا ہے۔ رحمان کا یہ خوبصورت اقدام اس کی زندگی سنوار دیتا ہے۔ رحمان گل کا گھرانہ ایک متوسط گھرانہ ہے۔ جہاں افراد خانہ کو امیرانہ تو نہیں مگر صاف ستھری زندگی ضرور مہیا کی گئی ہے۔ رحمان گل اپنے گھر کا سربراہ اور محافظ ہے۔ وہ اپنی اولاد کی اچھی پرورش کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ اپنی بیوی کو اس کا جائز مقام دیتا ہے۔ رحمان گل اور اس کی بیوی دونوں ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے لیے چھوٹی چھوٹی خوشیاں بڑی بڑی خوشیوں سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے اپنے خاندان کی خوشیوں کے لیے ان کی زندگی کے فیصلے ان پر مسلط نہیں کیے ہیں، بلکہ ان کی مرضی کو اہمیت دی ہے۔ بظاہر یہ بہت چھوٹا سا گھرانہ ہے۔ ان کے تین بچے ہیں، ایک بیٹا فوج میں دوسرا بیٹا ڈاکٹر جبکہ تیسری بیٹی جامعہ کی طالبہ ہے۔ ایک بیٹا باپ کے نیک خیالات کے باعث ایک بیوہ اور بے سہارا عورت کو اپنانے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو نام نہاد مجاہد اس عورت کو اغوا کر کے قتل کر دیتے ہیں، یوں وہ تو دہشتگردی کی نذر ہو جاتی ہے۔ مگر وہ ان دو بچوں کو اپنے گھر لے آتا ہے۔ یہ باپ کے نیک خیالات ہی تھے جو بیٹی کو اعلیٰ تعلیم یافتہ مخلوط تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے بھی بھٹکنے نہیں دیتے۔ ان کا ماحول بڑا پر سکون ہے۔ نہ ہی عناد ہے نہ تعصب، نہ ہی لڑائی جھگڑا ہے۔ مصلحت اور دوراندیشی کے باعث خوشگوار تعلق قائم ہے۔ بہن بھائی ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ گھر میں سب ایک دوسرے کے ساتھ عزت و احترام سے رہ رہے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی عائلی زندگی اسلام کے اصول و ضوابط کی روشنی میں گزر رہی ہے۔ اولاد ماں باپ کی فرمانبردار ہے۔ بیٹی باپ سے نمائش پر جانے کی اجازت چاہتی ہے مگر جھجک رہی ہے کہ باپ منع نہ کر دے۔ یہاں ہمیں ایک مشرقی روایتی گھرانہ نظر آتا ہے جہاں اولاد ماں کو آگے رکھ کر باپ سے اپنی بات منواتی ہے۔ زرغونے جھجکتی ہوئی باپ کو کہتی ہے۔

"زرغونے: وہ بابا میری تصویروں کی نمائش ہے میں جانا چاہتی ہوں۔

باپ (رحمان گل): بچے ان حالات میں تمہاری تصویروں کی نمائش دیکھنے کون آئے گا ضروری نہیں۔

زرغونے: بابا اب تو حالات بہت اچھے ہیں اور پتہ ہے سفیر آرہا ہے نمائش کی افتتاح کے لیے بابا یہ میرے لیے بہت اچھا موقع ہے۔

ماں: ادھر شیر جان کے پاس رہے گا اپنے بھائی کے پاس جانے دیں ناخان جی۔

باپ: تم کہتے ہو تو بچے اتنی تم نے محنت کی ہے تصویریں بنائیں تصویریں لوگ دیکھے بھی تو سہی نا بچے اجازت ہے جاؤ۔"(۹)

اس گھرانے میں ہمیں کسی قسم کا منفی رویہ نظر نہیں آتا ہے۔ سب پیار محبت عزت و احترام سے رہ رہے ہیں۔ مرد کی پہلی ذمے داری یہ ہے کہ وہ عورت کا قدر داں بنے۔ وہ عورت کے اندر چھپے ہوئے جوہر کو پہچانے۔ وہ عورت کے حسن باطن کو دریافت کرے۔ عورت کی شکل میں ہر مرد کو ایک اعلیٰ جبلی امکان ملتا ہے۔ اب یہ مرد پر منحصر ہے، کہ وہ اس کی قدر کرے یا اسے ضائع کر دے۔ ضروری ہے کہ عورت جو آدمی کو بیوی کے طور پر ملی ہے، وہ اسے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا انعام سمجھے۔ جب وہ اپنی بیوی کو خدا کا براہ راست عطیہ سمجھے گا تو فطری طور پر وہ اس کے بارے میں سنجیدہ ہو جائے گا اور یہ یقین کرے گا کہ خدا کا انتخاب غلط نہیں ہو سکتا۔ خدا کا انتخاب جس طرح درست ہوتا ہے، اسی طرح یہاں بھی درست ہے۔ مرد کا ذہن جب ایسا بنے گا تو اس کے بعد اس کی عائلی زندگی خود بخود سنورتی جائے گی۔ اپنی بیوی کو خدا کا تحفہ سمجھنے کے بعد اس کے ساتھ رہنے کو وہ عبادت سمجھے گا۔ وہ ہر ممکن قیمت ادا کرتے ہوئے یہ کوشش کرے گا کہ اس کی بیوی حقیقی معنوں میں اس کے لیے دنیا کی سب سے اچھی متاع حیات بن جائے۔

اس ڈرامے میں دو گھرانے نظر آتے ہیں۔ اول الذکر، نے تو بیوی کو بس ایک کھلونا جانا اس کے لیے بیوی ایک خریدی ہوئی شے ہے، جسے مارو پیٹو فرق نہیں پڑے گا، جبکہ موخر الذکر میں بیوی کو حقیقی معنوں میں عطیہ الہیٰ سمجھا گیا۔ اس کے ساتھ خوشگوار تعلق قائم کیا گیا جو ہمیں کرداروں کی حرکات و سکنات اور مکالموں کے ذریعے نظر آتا ہے۔

"تم ہو کہ چپ":

پیار محبت نفرت، انّا، تعصب اور لڑائی جھگڑے سے پُر کہانی "تم ہو کہ چپ" کے نام سے ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کہانی میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ ظلم کو برداشت کرنے والا ظالم کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔ اس کہانی میں کرداروں کی بھرمار ہے۔ خوب صورت مکالموں کے ذریعے حالات و واقعات کی بہترین عکاسی کی

گئی ہے۔ یہ ظلم اور بربریت کی ایسی داستان ہے جس میں رومانویت تو ہے مگر بہت نچلے درجے کی۔ پیار و محبت جو محسوسات کی زبان ہے، احساس سے عاری ہے۔ نیز حقیقی جذبوں کی توہین آمیز مناظر بھی موجود ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک سردار ہے۔ اس کی عائلی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں عائلی زندگی کا ایک الگ مگر بھیانک روپ دکھائی دیتا ہے۔ یہ خاندان پدرسری خاندان کی ذیل میں آتا ہے، جہاں مرد کے فیصلے چلتے ہیں۔ اس خاندان میں جاگیردرانہ طرزِ زندگی نظر آتا ہے جو اسلام کے اصولِ زندگی سے انحراف کرتا اور مرد کو غیر منصفانہ برتری اور فوقیت دیتا ہے۔ عورت کی ذات کی اہمیت حویلی میں سجے ہوئے فانوس سے زیادہ نہیں۔ فانوس بھی وہ جو توجہ بہت کم وقت کے لیے حاصل کرتا ہے اور اس کے بعد پرانا ہونے پر اپنی اہمیت کھو دیتا ہے ۔ عورت ذات کی وقعت و اہمیت سامانِ آرائش سے زیادہ نہیں، عورت امور خانہ داری تو سرانجام دیتی ہے مگر اپنے مرد کے کسی فیصلے کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم کرے۔ اس ڈرامے میں عائلی زندگی خالص جاگیردارانہ نظام کے تحت پیش کی گئی ہے۔ یہاں کے مردوں کو چار شادیوں کی بات تو ازبر ہے۔ مگر عورت کے حقوق یاد نہیں۔ مذہبِ اسلام پر تو فخر کرتے ہیں مگر مکمل اسلامی ضابطہ حیات نہیں اپناتے۔ جس کے باعث عورت استحصال کا شکار، بے وقعت و بے نشاں ہے۔ اس کا اس معاشرے میں کوئی مقام نہیں۔ یہاں کے مردوں کو اپنا حق تو یاد رہتا ہے۔ مگر یہ بھول جاتا ہے کہ عورت کے فرائض کیا ہیں۔ سردار جمال خان اپنے علاقے کا سردار اور قبیلے کا معزز شخص ہے۔ اس کے نزدیک اس کی اپنی ذات یا مرد ذات کی وقعت ہے، مگر عورت یا بیوی کی کوئی وقعت نہیں۔ اس کے لیے عورت صرف ایک کھلونا ہے۔ سردار جمال خان کی حویلی میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ کمی ہے تو علم کی۔ سردار جمال خان اور اس کی زوجہ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بین الاقوامی جامعہ کے پڑھے ہیں۔ دورانِ تعلیم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ سردار بی بی جانم کو اپنی بیوی بنا کر حویلی میں لے آتا ہے اور اسے ابتدائی دنوں میں ہی یہ بتا دیتا ہے کہ تمہاری ساری کشتیاں جل چکی ہے۔ تمہارے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں سوائے موت کے۔ میاں بیوی کی انوکھی محبت میں جنوں کا رنگ غالب ہے۔ سردار کی انا اور محبت بیوی کو باندی بنا کر قید رکھنے میں ہے، جبکہ بی بی جانم کی محبت تڑپنے کے ساتھ صبر کرنے میں دکھائی دیتی ہے۔ ان دو کرداروں کو عائلی زندگی کے تناظر میں دیکھا جائے تو انّا، صبر، محبت اور جنون کی مثالیں ملتی ہیں۔ جنون اور انّا

سردار کی اور صبر و محبت بی بی جانم کی شخصیت کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔ سردار اپنی طاقت کے بل پر بی بی جانم کو زیر کرلیتا ہے اور ساری زندگی کے لیے قید کر کے رکھ لیتا ہے۔

ایک عورت اور ایک مرد نکاح کے رشتے میں بندھ کر اس قابل بنتے ہیں کہ وہ خود اپنی ایک دنیا تعمیر کریں مگر غیر حقیقی محبت کے نتیجے میں وہ اپنے بچوں کو اپنی امیدوں کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت والدین کی ذمے داری ہے، نہ کہ ان کی زندگی کا مقصد۔ والدین اگر اس فرق کو سمجھ لیں تو وہ کبھی افسردگی اور مایوسی کا شکار نہیں ہوں گے۔ بی بی جانم نے بھی ایسا ہی کیا اس کے سامنے اس کا بیٹا تھا۔ اس نے اس کو اپنی زندگی کا مقصد جان لیا۔ بی بی جانم اللہ سے بھی لو لگا لیتی ہے۔ مگر کوشش کے باوجود اپنے اکلوتے بیٹے کو باپ کے نقش قدم پر چلنے سے نہیں روک پاتی ہے ان دو افراد میں ذہنی ہم آہنگی دکھائی نہیں دیتی ایک بے صبر اتو دوسرا صبر کے گھونٹ پیتا ہے ۔ایک میں غصہ ہے تو دوسرا معاملہ فہمی اور دور اندیشی سے مسئلہ سلجھا لیتا ہے ۔ سردار جمال خان کے خاندان کا دستور ہے، کہ یہاں کا مرد اپنی پسند کی شادی جتنی مرضی کرے مگر ایک خاندانی بیوی ضرور رکھتا ہے۔ جو خاندان کی پہچان ہوتی ہے بی بی جانم خاندان کے مرد کی سوچ کو اس طرح سے واضح کرتی ہے۔

> ”بی بی جانم: اس حویلی کے مرد کو اگر گھوڑی پسند آجاتی ہے تو وہ اپنی کنیز دے کر گھوڑی خرید لیتا ہے۔“(۱۰)

اس جملے میں گھر کا غلامانہ ماحول اور واضح ہو جاتا ہے سردار جمال خان کے نزدیک شادیاں کرنا بڑا فخر کا کام ہے۔ وہ شادی کرنے کے لیے عمر کے فرق کو نہیں دیکھتا۔ اس ڈرامے میں اس کی تین بیویاں دکھائی گئی ہیں۔ تینوں میں اسے زیادہ پسند اپنی پہلی بیوی ہی ہے۔ جب بی بی جانم کو اس کی تیسری شادی کرنے کی خبر ملتی ہے تو وہ پہلے تو حیران ہوتی ہے پھر کہتی ہے۔

> "بی بی جانم: ہمارے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے ہمارے لیے ایسی خبریں آتی رہتی ہیں۔ مگر وہ تو ایک سردار ہے اور پری وش ایک باندی! باندی کی شادی تو کارندے سے ہوتی ہے۔ انہوں نے خود شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"(۱۱)

اس حویلی میں ماں کا بچے پر کوئی حق نہیں ،اگر حق ہے تو صرف پیدا کرنے کا۔ بی بی زیتون جو

سردار جمال خان کی دوسری بیوی ہے کا یہ جملہ ماں کی کمتر حیثیت کو واضح کر دیتا ہے۔

"بی بی زیتون: تیرے کو کس نے بولا یہاں پر ماں کا نہ بچے پر حق ہے ادھر مرغی کا کام انڈا دینا ہے۔ مالک کا مرضی اٹھاوے نہ اٹھاوے۔"(۱۲)

عائلی زندگی کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان کرداروں میں مرد حاکم اور عورت محکوم کا رتبہ رکھتی ہے۔ سردار کو مرد کی چار شادیوں کے حکم کا تو علم ہے، مگر عورت کے حقوق و فرائض کا علم نہیں۔ عورت اپنی بے بسی پر روتی ہے۔ پہلی بیوی اپنے ہاتھوں سے دوسری کو دلہن بنا کر سردار کے سامنے حاضر کرتی ہے۔ اسی طرح تیسری بیوی بھی یہی کام سرانجام دیتی ہے۔ یہاں سردار کی بیویوں کے یہ مکالمے ہمیں ان کی بے بسی کی داستان سناتے ہیں۔

"بی بی زیتون: بی بی جانم، پری وش کو میں نے تیار کر دیا ہے۔ یہ تو میرا حق تھا۔ بی بی زیتون میں نے تو اپنا حق بہت پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب تمہیں شادی کی رات تیار کیا تھا ایک دن یہ بھی اپنا حق چھوڑے گی۔"(۱۳)

اس کے نزدیک عورت کے جرم کی کوئی معافی نہیں۔ اگر غداری کرے گی یا بے وفائی کرے گی تو اس کی سزا صرف موت ہے، موت بھی بھیانک۔ سردار جمال خان اپنی تیسری بیوی کو حویلی سے بھاگنے پر طلاق تو دے دیتا ہے مگر اسے کال کوٹھری میں ڈال دیتا ہے۔

"سردار جمال خان: مجرم، مجرم ہوتا ہے۔ پری وش پر جرم ثابت ہو چکا ہے۔ اب اس کی باعزت سزا تو یہ ہے کہ اس کو ہم اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دے۔ دوسری سزا یہ ہے کہ یہ ہمارا ہمشیرہ سائیزن کے ساتھ کال کوٹھری میں زندگی گزارے۔ مگر یہ دونوں بہت باعزت سزائیں ہیں۔ پری وش پہلے بھی اس حویلی کا باندی تھا، مگر ہم نے اس کے ساتھ نکاح کر کے اس کو ملکہ بنا دیا مگر باعزت آدمی کا سزا بھی اسی میں ہی ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس حویلی میں باندی بن کر رہے گا۔ پری وش آج سے ہم پر حرام ہے۔"(۱۴)

اسی طرح ایک اور جگہ سردار کا بھیانک روپ ہمیں نظر آتا ہے۔ جب اپنی عزیز بیوی جسے وہ صرف

لفظی محبت کرتا ہے کو سزا سناتا ہے۔ بی بی جانم عورت کے غم کو پہچانتی ہے اور اپنے بیٹے کی ولایتی بیوی کو حویلی سے بھگانے میں مدد کرتی ہے۔ اس کے خیال سے کہ میں زندگی میں کوئی اچھا کام کر جاؤں۔ سردار جمال خان اسے مجرم ثابت کرتے ہوئے زندہ قبر میں دفنانے کا حکم دیتا ہے تاکہ بی بی جانم کی بھیانک موت سے قبیلے میں میرا رعب و دبدبہ بڑھ جائے۔

ان کی عائلی زندگی غیر متوازن رویے کی حامل تھی۔ سردار کے رعب کے باعث سب اس سے ڈرتے تھے اور اسی ڈر سے حویلی کی عورتیں اس کے ظلم کو برداشت کرتے ہوئے اس کے ظلم کو اور بڑھاوا دیتی تھیں۔ سردار جب زنان خانے میں آتا ہے تو حویلی کی عورتیں اس کے خوف سے کانپتی ہیں۔ بیویاں ارد گرد منڈلانا شروع کر دیتی ہیں۔ پری وش اور سردار کا کمرے کا منظر غلامانہ ماحول کو واضح کرتا ہے۔ جب سردار اپنی پری وش کے پاس آتا تو وہ اس کے پیر اپنی جھولی میں رکھ کر اس کے جوتے اتارتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف ہوتا ہے اور اس پر بے بسی طاری ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس کی پگڑ کو اتار کر رکھتی ہے۔ وہ سردار کی بیوی سے زیادہ باندی کا کردار ادا کرتی ہے۔ "جانان: اب اس حویلی کا سارا اندر کا خبریں تم ہم کو دے گا۔"(۱۵)

حویلی کا ماحول باپردہ ہے۔ کسی غیر مرد کو حویلی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اگر بامر مجبوری کسی غیر مرد کو حویلی کے اندر داخل بھی ہونا پڑے تو حویلی کی عورتوں کو پردہ کروادیا جاتا ہے۔ پہلی قسط کا منظر ہم پر یہ سب واضح کرتا ہے۔ اس خاندان کے ملازم یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ حویلی کی عورت سامنے آئے تو اپنی نظریں پھیر لینی ہیں۔ جب مشل میر ضرار کے ساتھ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتی ہے تو میر ضرار کے محافظ مشل کو دیکھتے ہی نظر پھیر کر اپنا رخ تبدیل کر دیتے ہیں۔ جب میر ضرار اپنی بیوی کو شب کے لباس میں کمرے سے باہر دیکھتا ہے تو اسے اس بات پر تنبیہ کرتا اور برہمی کا اظہار کرتا ہے۔

"میر ضرار: تمہیں کتنی دفعہ کہا ایسے باہر مت نکلا کرو۔

مشل: یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

میر ضرار: کیا ہو رہا ہے تمہیں excitement کے اور بھی بہت سے مواقع ملیں گے اندر چلو۔

مشل: this is no excitement any more اور یہ میں نہیں ہونے دوں گی۔

ضرار: آہستہ بولو حویلی میں سب یہاں آہستہ بولتے ہیں۔"(۱۶)

اسی کہانی کا دوسرا اہم کردار میر ضرار ہے جو سردار جمال خان کا اکلوتا بیٹا اور ایک بڑی جاگیر کا اکلوتا وارث ہے۔ وہ اپنے باپ کا پرتو ہے۔ اس کی عائلی زندگی اپنے باپ کی زندگی سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس کی عائلی زندگی ابتدا میں رومان اور محبت سے پُر ہے۔ اس نے بھی ولایت میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران مشل نامی لڑکی کو پسند کیا اور اسے بیاہ کر پاکستان لے آیا ہے۔ مشل ایک لاابالی ذہن کی معصوم لڑکی ہے۔ جو اپنے خوابوں اور خیالوں میں جی رہی ہے۔ اس کے نزدیک شادی شدہ زندگی سیر و تفریح سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے نزدیک اس کے خواب ہی حقیقت ہیں۔ وہ ہر بات میں اپنے خوابوں کا اپنے خوابوں کے شہزادے کا ذکر کرتی ہے۔ جب میر ضرار کی شکل میں اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ مل جاتا ہے تو اسے اپنا لیتی ہے۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے اس کو آزادانہ ماحول دیا گیا ہے۔ وہ آزاد ماحول کی پروردہ ہے۔ قید کو وہ کسی صورت قبول نہیں کر سکتی۔ وہ میر سے شادی بھی اسی باعث کرتی ہے کہ وہ پاکستان گھوم پھر کر واپس آجائے گی۔ اس کے لیے شادی ایک ذمہ داری نہیں بلکہ سیر و تفریح ہے۔ میر ضرار اس کے لیے پرخلوص شوہر ثابت ہوتا ہے۔ وہ ایک محبت کرنے والا شوہر ہے۔ مشل اس کی ہمسفری میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی محسوس کرتی ہے۔ ان دونوں کی شادی کے ابتدائی دن بہت حسین اور رومان میں ڈوبے ہوئے گزرتے ہیں مگر مشل کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس سویرے کے بعد اس کی زندگی میں سیاہ اندھیرا چھا جانا ہے۔ میر ضرار سب سے پہلے اپنی بیوی کے ہمراہ لایا گیا سامان غائب کرواتا ہے اور اس کے بعد اس کا پاسپورٹ بھی اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔ اس کا اصل روپ اس وقت اپنی بیوی پر ظاہر ہوتا ہے جب وہ اس سے واپس جانے کی بات کرتی ہے تو اس کا رویہ اور انداز بدل جاتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی تکلیف کو نہیں سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک محبت صرف یہی ہے کہ جو چیز پسند آجائے اس کو اپنے پاس رکھ لو۔ میر ضرار کا کردار سردار جمال خان کے کردار سے ملتا ہے۔ اس پر اس کی ماں کی تربیت کا بھی اثر نہیں ہوتا اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح دھوکے سے شادی کر کے لڑکی کو لے آتا ہے۔ لڑکی کے لیے سب سے مشکل مرحلہ اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوسرے گھر آکر رہنا اور نئے طور اطوار سیکھنا ہوتا ہے۔ مصنف ڈرامے کے آغاز میں اس بات کو واضح کرتا ہے

"جب کوئی لڑکی کس بھی نئی زمین کے لیے اڑان بھرتی ہے، تو اس کے دل میں بہت

سی امنگیں اور خیال میں بہت سے خواب ہوتے ہیں لیکن وہ اجنبی زمین کی reality کو
نہیں جانتی۔"(۱۷)

ان لفظوں میں چھپی حقیقت ڈرامے کے آغاز سے ہی ہم پر واضح ہو جاتی ہے لڑکی کا شادی کر کے دوسرے گھر جانا ادھر کے ماحول کو اپنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسی لڑکی جو مغرب کی پروردہ ہے۔ اس کے لیے مشرق کے انتہائی سطحی قبائلی ماحول کو اپنانا بہت مشکل ہوتا ہے اور جب اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے تو وہاں گزارا کرنا انتہائی مشکل ترین عمل بن جاتا ہے۔ مرد اپنی فطرت کے اعتبار سے انانیت پسند ہے اور عورت اپنی فطرت کے اعتبار سے جذباتی ہے۔ اسی فرق کی بنا پر اکثر دونوں میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان اس فرق کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ ہمیں ان دونوں کرداروں میں یہ بات واضح انداز میں دکھائی دیتی ہے۔

مشل کی ازدواجی زندگی اس وقت بھیانک ہوتی ہے۔ جب اس کے ہر انداز پر تنقید کی جاتی ہے۔ ولایتی کپڑے پہننے پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ ملازموں کے ذریعے بتایا جاتا ہے کہ ادھر کی عورت ایسے رہتی ہے۔ مشل کے والدین جو ان باتوں سے واقف نہیں ہوتے شروع میں اس سے بات کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ ان کی بیٹی کی ازدواجی زندگی کتنی دکھ بھری ہوتی جا رہی ہے۔ میر ضرار بھی اپنے باپ کی طرح حاکم بن کر فیصلے کرتا اور بیوی کو محکوم سمجھ کر اس پر حکومت کرتا ہے۔ میر ضرار کی پہلی بیوی مشل نہیں بلکہ خاندان کی خوبصورت جوان لڑکی ہوتی ہے۔ وہ ولایت جانے سے پہلے اس سے شادی کر کے اس کی آنکھوں میں بھی خواب سجا کر جاتا ہے۔ میر ضرار دوہری شخصیت کا حامل ہے۔ جس کے نزدیک لفاظی کا کھیل ایک دلچسپ کھیل ہے۔ اس کھیل سے سب کو رام کرتا ہے۔ اپنی بیوی اور دوسروں کا باتوں سے ہی دل بہلاتا ہے۔ اس کی بات حرفِ آخر ہے۔ جو اس نے کہہ دیا وہی کرے گا۔ وہ اپنی بیوی کو قید کر کے رکھتا ہے۔ اس کو سخت پہرے میں رکھا جاتا ہے کہ وہ کہیں فرار نہ ہو جائے یا اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا لے۔ اس کے نزدیک اس کی بیوی سے زیادہ اس کا بچہ اہمیت کا حامل ہے، جو ابھی اس دنیا میں آیا بھی نہیں ہے۔ وہ اپنی بیوی کو باور کرواتا ہے کہ اس کا بچہ خیر خیریت سے اس دنیا میں آجانا چاہیے۔ مشل آزادی کے لیے اپنی اولاد کی بھی پروا نہیں کرتی۔ اس کے لیے آزادی ضروری ہے مگر اولاد نہیں۔ اس کے ہذیانی انداز میں کہے گئے جملے

اس کے ذہنی سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔

"مشل:(روتے چیختے اپنے آپ کو مارتے ہوئے) چھوڑ دو مجھے، چھوڑ دو میں مار ڈالوں گی خود کو اور اس بچے کو میں اس بچے کو دنیا میں نہیں لاؤں گی۔"(۱۸)

اس کے خواب محبت اعتبار سب بھاپ کی طرح اڑ کر ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں۔ اس لمحے وہ نہ تو یہ سوچتی ہے کہ اس کی شادی شدہ زندگی برباد ہو جائے گی اور نہ ہی وہ یہ سوچتی ہے کہ وہ تنہا رہ جائے گی۔ اس وقت وہ صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اس کو آزادی چاہیے وہ حویلی کے آرام اور بادشاہی نظام کو پس پشت ڈال کر صرف آزادی کی خواہاں ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ظلم برداشت نہیں کرتی، بلکہ اس کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ ضرار اس پر جتنے مرضی پہرے بٹھالے مگر جب اللہ نے بندے کو اپنی پکڑ میں لینا ہوتا ہے تب انسان عبرت کا نشان بن ہی جاتا ہے۔ ان سرداروں نے بھی معصوم عورتوں پر بہت ظلم کیے مگر مشل ظلم پر صبر کرنے کے بجائے باغی ہو گئی۔ اس نے قید میں پھڑ پھڑانے کا عمل جاری رکھا۔ اس کی حویلی سے بھاگنے کی ایک کوشش ناکام ہوئی تو دوسری کوشش میں وہ کامیاب ہو گئی۔ وہ وہاں سے فرار ہو کر ولایت پہنچ جاتی ہے۔ میر ضرار اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ اس سے خلع لے لیتی ہے۔ ضرار اسے اور اس کے ماں باپ کو قتل کروانے کی دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تم دوسری شادی نہیں کرو گی۔ اگر کی تو تمہارے خاندان اور تمہارے شوہر کو مروادوں گا۔ مشل دوسری شادی تو نہیں کرتی مگر اپنے بیٹے کو پالتی اور اس کی تربیت کرتی ہے۔ ساری زندگی تنہا رہتی ہے مگر میر اور سردار جمال خان جیسے مرد عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔ جب سردار جمال خان بیوی کو زندہ قبر میں اتارنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کا بیٹا رو رو کر اپنے باپ کی منّت کرتا ہے مگر سردار اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ ضرار ذہنی صدمے سے دوچار ہو جاتا ہے اور دشمن اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے قتل کر دیتے ہیں۔ سردار جمال خان اسی صدمے کے باعث معذور ہو جاتا ہے ااور وہ ساری زندگی معذوری میں گزار دیتا ہے۔ سردار جمال خان کا حاکمانہ رویہ ہمیں گھر اور گھر کے باہر کے ماحول میں نظر آتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو زندہ درگور کرنے پر فخر محسوس کرتا ہے اور اس بات کو اپنی جاگیر کے رسم و روایات کا حصہ بتاتا ہے۔ میر ضرار اور سردار جمال خان کے مکالمے ہمیں قدم قدم پر ان کی پست سوچ اور پست ذہنیت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کی سوچ کتنی گری ہوئی اور پست ہے۔

"سردار جمال خان: میر ضرار یہ منہ پھیرنے کا وقت نہیں ہے اپنے مجرم کو دیکھو اس پر مٹی ڈالو۔ اپنی روایات اپنی رسم اپنی تاریخ کو زندہ رکھو تا کہ لوگ تم پر فخر کریں۔

میر ضرار: (روتے ہوئے) میں نے ایسی کوئی روایت نہیں سنی۔

سردار جمال خان: (رعب سے بولتے ہوئے) اگر تم نے نہیں سنی تو یہ ہمارا نااہلی ہو گا۔ یہ ہمارا روایت ہے یاد رکھو یہ تعلیم یہ ڈگری صرف دکھانے کا واسطے ہم لوگ اپنی روایت کا پابند ہے اٹھاؤ مٹی۔"(۱۹)

ادھر سردار جمال خان کی شخصیت واضح طور پر نظر آتی ہے کہ کیسے وہ بیٹے کو جھوٹ کا سبق پڑھا رہا ہے۔ اس ڈرامے میں عائلی زندگی میں توازن نہیں ہے۔ اس ڈرامے میں مردوں کا رویہ غیر مناسب نظر آتا ہے۔ مرد کچھ بھی کر سکتا ہے مگر عورت اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتی۔ سردار جمال خان اپنی بہن کو صرف اس لیے قید خانے میں بند کر دیتا ہے کہ کہیں وہ جائیداد میں حصہ دار نہ بن جائے۔ چنانچہ اسے دماغی طور پر مفلوج ثابت کر کے زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ اس کی بہن کے جملے ہمیں بتاتے ہیں کہ معصوم بے گناہ کی آنکھ ظالم کو کیسے عبرت کا نشان بنا دیتی ہے۔ "بی بی جانم کی اللہ نے سن لی اب تمہارا رسم ورواج مٹی میں مل جائے گا تمہارا پگڑیاں تار تار ہو گا۔"(۲۰)

حویلی کا ماحول سادہ مگر دلچسپ ہے۔ قبائلی علاقے کے لباس میں ملبوس خواتین ادھر ادھر جھلملاتی پھرتی ہیں۔ سب خواتین کے سروں پر ڈوپٹے ہیں۔ حویلی میں کسی غیر مرد کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ تمام کام خواتین ملازمائیں ہی سر انجام دیتی ہیں۔ جس کے لیے ایک بڑی ملازمہ موجود ہے جو تمام چھوٹی ملازماؤں کو حکم دیتی ہے۔ تین تین بیویاں ہونے کے باوجود حویلی میں جھگڑا نظر نہیں آتا ہے۔ جبکہ خواتین میں آپس میں بہت ہم آہنگی ہے۔ سردار کی دونوں بیویاں دوست بنی ہوئی ہیں، اور ایک دوسرے کے دکھ سنتی اور بانٹتی ہیں مگر ڈرامہ کے اختتام تک بیوی زیتون جو سردار کی دوسری بیوی ہے میں حسد و رقابت کے جذبات ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مَشعل سے حویلی میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ قدامت پسندی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حویلی کے باہر محافظوں کی فوج بھی نظر آتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دشمن سے حفاظت کے لیے کھڑے کیے گئے ہیں۔ الغرض عائلی زندگی میں توازن نظر نہیں آتا۔ سردار جمال خان اور میر ضرار

دونوں لفظی محبت کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں عورت ذات کی وقعت و اہمیت اس طرح سے نہیں ہے جیسی اسلام نے عورت کو دی ہے۔

"دل تو بھٹکے گا"

اگر کسی انسان کو معاشرے کے لیے مفید بننا ہے، تو اس کے لیے عائلی زندگی کی ضرورت ہے۔ اس کی ضرورت انسان کو بچپن سے لے کر جوانی تک پڑتی ہے۔ کسی بچے کی صحیح نشوونما کے لیے اس سے محبت کرنے والا اور حقیقی ربط رکھنے والا گھر ہی صرف وہ ماحول فراہم کرتا ہے جسے خالص ماحول کہا جاسکتا ہے۔ کوئی اور ادارہ گھر کے ماحول کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ گھریلو ماحول انسان کو خوشگوار زندگی فراہم کرتا ہے۔ علم نفسیات کی جدید ترین تحقیقات نے ان اثرات کو واضح طور پر پیش کر دیا ہے، جو ایک انسان کے بچپن کے ماحول کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ کسی جوان عورت یا مرد کے لیے عائلی زندگی کا مقام دنیا کے اس وسیع و عریض نخلستان میں ایک ایسا محفوظ مقام ہے جہاں وہ رہنے کے لیے جاتا، آرام کرتا ہے اور اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان ہمدردی کرنے والے رشتوں اور مخلص اقربا سے غافل نہیں رہ سکتا۔ انسان کو زندگی میں ہر طرح کے حالات پیش آتے ہیں، زندگی مشکلات سے عبارت ہے۔ اگر زندگی مشکلات سے خالی ہو جائے تو اسے ہم عام زندگی نہیں کہہ سکتے۔ ماحول کے بدلاؤ سے ہی حالات بدل جاتے ہیں۔ دنیا اور گھر کے ماحول سے الگ تھلگ زندگی انتہائی نچلے درجے کی زندگی ہے۔ اسی طرح گھر کے ماحول سے بے نیاز ہو کر وسیع ماحول میں کوئی انسان کامیاب نہیں ہو سکتا۔ عائلی زندگی کے بغیر دنیاوی زندگی کا تصور بھی ممکن نہیں۔ عائلی زندگی کی بنیاد نکاح پر استوار اور باضابطہ نظام پر قائم ہے۔

"دل تو بھٹکے گا" ایک جاگیر دارانہ مزاج کے حامل ٹھاکر خاندان کے مسائل، رسم و رواج، طرزِ زندگی اور عادات و اطوار کو سامنے لاتا ہے۔ ٹھاکر خاندان جاگیروں کا مالک، دولت اور بیٹوں کی نعمت سے مالا مال ہے۔ یہ خاندان جمہوری خاندان کی ذیل میں آتا ہے۔ ٹھاکر اپنے تین بیٹوں، بیوی اور ملازماؤں کی فوج کے ساتھ حویلی میں پورے طمطراق سے رہتا ہے۔ اس کی سوچ جاگیر دارانہ اور ہر شے پر حکومت کرنے والی ہے، ایسی ہی سوچ اس کی بیوی کی بھی ہے۔ گھر کے سربراہ یعنی والدین کو دیکھ کر بادشاہ اور ملکہ کا گمان ہوتا ہے۔

دونوں شخصیات حویلی پر چھائی ہوئی ہیں۔ ان دونوں کا کردار ناصحانہ، مدبرانہ اور حاکمانہ کردار ہے۔ڈرامے کا آغاز ریل گاڑی آنے کے منظر سے ہوتا ہے مگر پورا ڈرامہ حویلی میں فلمایا گیا ہے۔ جس میں سے چند مناظر حویلی سے باہر شہر کی جامعہ اور شہر کے ہوٹلز کے ہیں۔ افراد خانہ کے کردار اپنے فعل میں مکمل طور پر آزاد ہیں ۔ان کے نزدیک ان کا کہا حرفِ آخر ہے۔ شاندار حویلی میں ہر آسائش موجود ہے۔ افراد خانہ کے الگ الگ شاندار کمرے ہیں۔ حویلی سامانِ آرائش سے لبریز ہے جو امیرانہ زندگی جی رہے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔

روپیہ پیسا ہونے کے باوجود ان کے گھر میں سکون کی کمی ہے۔ باپ اپنے بیٹے کو امیر ہونے کا بتاتا ہے اور کہتا ہے سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ کہانی کے آغاز میں اپنے بیٹے کو پیسے مانگنے پر یوں کہتا ہے۔

" یہ کیا بچوں کی طرح خرچے کی بات کرتا ہے۔ یہ سب تیری ریاست ہے، تیری جائیداد ہے اور کل بھی ہم مالک تھے اس جائیداد کے، اس دھرتی کے اور آج بھی ہم مالک ہیں۔ کیا بچوں کی طرح خرچہ خرچہ کر رہا ہے؟"(۲۱)

باپ ادھر اپنی سوچ واضح کرتا ہے اور بیٹے کو بھی اسی بات کی تلقین کرہا ہے کہ سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ اس حویلی میں دولت کی کسی قسم کی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ باپ اپنے بیٹوں کو اپنے ارد گرد دیکھنا چاہتا ہے مگر اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی۔ اس کے بیٹے اس کا سہارا نہیں بنتے بلکہ اسے تنہا کر دیتے ہیں۔ اور وہ یوں اس کیفیت کا بیان کرتا ہے۔

"میرے چھوٹے بچے، میرے تین بچے ہیں ایک کو تو طوائف اور شراب کھا گئی۔ دوسرے کی برآت کل لے کر آیا ہوں۔ اگر تجھے بھی میں international art کے حوالے کر دوں تو پھر میرے پاس باقی کیا بچا۔"(۲۲)

گھریلو مسائل جو تقریباً ہر گھر کو درپیش ہیں اکثر اوقات ایسے زبردست طوفان بن جاتے ہیں جس کی لپیٹ میں نہ صرف ایک بلکہ متعدد انسانی زندگیاں آجاتی ہیں۔ تاریخ کے اوراق کو الٹ کر واقعات و حوادث کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قوموں کی نسلی خصوصیات اور خاندانی روایات نے ان کے اجتماعی اخلاق کی تعمیر میں ناقابل انکار اثرات کا کام کیا ہے، بلکہ بسا اوقات ان خصوصیات نے تقدیریں بدل کر رکھ دی ہیں۔ ایک

شخص دوستوں میں بدنام ہو کر اور قوم میں رسوا ہو کر اپنے کنبے اور گھرانے میں منہ چھپا سکتا ہے۔ لیکن اپنے گھر میں رسوا ہو کر دوستوں میں نیک نام بن جانا آسان کام نہیں ہے۔ اجتماعی اخلاقیات میں خاندانی اعزاز و سربلندی بڑی اہم چیز ہے۔

اس حویلی میں تناؤ کی کیفیت نظر آتی ہے۔ جس کے باعث کہانی میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ کہانی کا آغاز ٹھاکر کے دوسرے بیٹے کی شادی سے ہوتا ہے جس کے لیے وہ دوسرے شہر سے دلہن بیاہ کر لا رہا ہے ۔ دلہن خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ ریل کے پورے ڈبے میں خوشی کا سماں ہے۔ ناچنے والیاں ناچ رہی ہیں جبکہ ٹھاکر کا بڑا بیٹا شراب کے نشے میں دھت شراب کا گلاس پکڑے کبھی کسی کے ساتھ ناچ رہا ہے اور کبھی کسی کے ساتھ۔ اس خوشی کے منظر میں ہمارے سامنے ایک ایسا کردار آتا ہے جس کے چہرے پر خوشی نہیں ہے۔ وہ سجی سنوری ایک کونے میں بیٹھی سسک رہی ہے اور اپنے شوہر کو دیکھ رہی ہے۔ وہ اپنی شادی کا دن یاد کر کے دکھی ہو رہی ہے۔ جبکہ حسن بانو دلہن شرمائی لجائی سی مسکرا رہی ہے۔ دونوں کی شادی شدہ زندگی مختلف ہے ۔ دونوں عادات کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی باعث دونوں کو ایک دوسرے کے رویے پریشان کرتے ہے۔ روایتی حسد و رقابت دونوں میں نظر آتا ہے۔ یاسمین حسن بانو سے اس لیے حسد کرتی کہ وہ اپنی شادی شدہ زندگی میں خوش ہے۔ اس کا شوہر اس کے لاڈ اٹھاتا ہے، جب کہ یاسمین کا شوہر اس سے محبت نہیں کرتا۔ دوسری طرف حسن بانو یاسمین کی گھر میں برتری پر چڑتی ہے۔ یاسمین بڑی بہو ہونے کے باعث اہم مقام رکھتی ہے، دوسرا وہ امیر خاندان کی لڑکی اور بہت بڑی جائیداد کی مالک ہے۔ جس کے باعث حسن بانو اس سے حسد کرتی ہے۔

اس خاندان کے تین بچے ہیں۔ تینوں عادات کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ٹھاکر اور اس کی بیوی نے اپنے بیٹوں کی پرورش تو کی ہے مگر آزاد ماحول نے ان پر مختلف اثر ڈالا ہے۔ اس کا بڑا بیٹا عیاش ہو گیا ہے۔ اس کو شراب اور شباب کی لت لگ گئی ہے ۔ اسی باعث وہ گھر میں نہیں پایا جاتا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا غلط عورتوں کے ساتھ ہی ہے، یہ ایک اوباش قسم کا انسان ہے ۔ جس کی سرشت میں بری عادات شامل ہو گئی ہیں۔ اس کی اس عادت کے باعث والدین اس کی شادی کر دیتے ہیں۔ شادی کرنے کے باوجود اس کے رنگ ڈھنگ نہیں بدلتے۔ وہ اپنی بیوی کو بھی تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بیوی پر توجہ نہیں دیتا۔ وہ لڑکی جو اپنا گھر بار

اپنا سب کچھ اس ایک شخص کے لیے چھوڑ کر آتی ہے، اور وہ شادی کی رات ہی کوٹھے پر گزار دیتا ہے۔ اس کی نسوانیت کا مذاق بناتا ہے اور اس کے چہرے کو ہنسی و طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کے لیے رنگ برنگی تھرکتی لڑکیاں کشش کا باعث ہیں۔ جبکہ سادہ خاتون جو شکل وصورت کی بھلی معلوم ہوتی ہے، شریف اور امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس پر توجہ نہیں دیتا۔ اس کے اس رویے کے باعث اس کی بیوی احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ زندگی میں مشکلات صرف چند کرداروں کے ہاں نظر آتی ہیں۔ باقی کردار بہت کم وقت کے لیے غم میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنی زندگیوں میں مگن ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے بہو کا غم بہت بڑا غم نہیں ہے۔ وہ بات کو ٹالتے رہتے ہیں اور بیٹے کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ والدین کے لیے شرمندگی صرف یہ ہے کہ کوئی بیٹے کو نشے کی حالت میں نہ دیکھ لے اگر کسی باہر کے بندے نے نشے کی حالت میں دیکھ لیا تو کیا ہو گا۔ حویلی کا ماحول افراد خانہ کی خاموشی کے باعث پُر اسرار بنا ہوا ہے۔ ہر فرد اپنے اپنے کمرے میں مقیم ہے۔ اگر آپس میں بات کرتے بھی ہیں تو کسی مقصد کے تحت۔ حسن آرا، یاسمین کی ازدواجی زندگی کو بہتر کرنے کے لیے اس کو مشورہ دیتی ہے مگر یاسمین اپنی ذات میں مگن رہتی ہے۔ حسن بانو اس کو سجنے سنورنے کی تلقین کرتی ہے تو وہ اس کی بات کو گھٹیا گردانتی ہے۔ ان کا یہ مکالمہ دونوں کی سوچ کو واضح کرتا ہے۔

"حسن بانو: دیکھیے بھابھی کسی اداس روپ کو دیکھ نہیں سکتی میں۔

یاسمین: آنکھیں بند کر لیا کرو

حسن بانو: آنکھیں بند بھی کر لوں تو اندر کھل جاتی ہیں۔

یاسمین: یہ سب نہیں کر سکتی میں۔

حسن بانو: بھابھی ہر شام تیار ہو کر امراؤ جان بنیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے اپنے مرد کو رجھایئے اس کو راضی کیجیے۔

یاسمین: اس کا مطلب ہے کہ ہر بیوی کو طوائف کی طرح رہنا چاہیے۔

حسن بانو: بھابھی آپ نے تو وہ بات خود ہی کر دی۔

یاسمین: نہ میں کنجری ہوں نہ میں طوائف جس رات میں اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی اسی رات میرا شوہر مجھے سہاگ کی سیج پر بیٹھا کر طوائف کے پاس چلا گیا تھا، دلہن کی

طرح تیار تھی میں۔"(۲۳)

گھر کا ماحول امیرانہ ہے، مگر تعصب خود غرضی لیے ہوئے ہے۔ گھر کے ماحول میں اس وقت بدلاؤ آتا ہے، جب وہ چھوٹی بہو بیاہ کر لاتے ہیں۔ رنگین مزاج سی لڑکی جس کو لوگوں کو قابو کرنے کے سارے گر آتے ہیں۔ چھوٹی بہو کے لیے شرافت کے اور ہی معنی ہیں۔ وہ سادہ لوح ہونے کو شرافت نہیں مانتی۔ دونوں کی ازدواجی زندگی اس وقت کھل جاتی ہے۔ جب دونوں کے نظریے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ یاسمین جو شریف ہونے پر فخر کرتی ہے اس کا شوہر اس کی کمیاں گنوا جاتا ہے۔ یاسمین کے شوہر کے جملے ان کی زندگی کو پیش کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کیسے گزر رہی ہے۔

"یاسمین: میں نے کیا کیا ہے بلاول!

بلاول: تم نے کیا کیا ہے، دیکھو ذرا اپنی طرف دیکھو یہ اجڑا ہوا چہرہ، یہ سوکھے ہوئے ہونٹ، دقیانوسی کپڑے، کیا ہے یہ سب۔ مجھے مجبور نہیں کرتے کہ میں گھر سے باہر کسی اور کی طرف دیکھوں، دو دو ٹکے کی لڑکیوں سے دل بہلاؤں، کس کا جرم ہے یہ، کس نے کیا ہے یہ سب۔

یاسمین: لیکن میں تو تمہاری بیوی ہوں۔

بلاول: تو کون سی کتاب میں لکھا ہے کہ بیویوں کو شہروں کے لیے سجنا نہیں چاہیے۔ کیا تمہیں یہ simple سی بات نہیں پتا کہ جس مرد کو گھر میں اچھا کھانا نہیں ملتا وہی hotel جاتا ہے۔

یاسمین: میں یہ سب کیسے کر سکتی ہوں بلاول میں حسن بانو تو نہیں ہوں۔

بلاول: میری جان شوہر کو قابو کرنے کے لئے ہر لڑکی کو حسن بانو بننا پڑتا ہے۔"(۲۴)

بلاول اس کو اس کا چہرہ دکھا کر چلا جاتا ہے روڈ ایکسیڈنٹ میں جب یاسمین کا شوہر مر جاتا ہے تو اسے علم ہوتا ہے کہ اس نے اپنا کتنا وقت برباد کیا۔ شوہر کی موت کی خبر آنے سے پہلے وہ خوبصورتی سے لال جوڑا پہن کر تیار ہوتی ہے۔ مگر قدرت اس کو مہلت نہیں دیتی اس کا شوہر اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس میں نہ محبت تھی نہ وفا، ان دونوں نے پانچ سال کا عرصہ ایک دوسرے کی سنگت میں گزارا مگر یاسمین نے اپنے شوہر کو غلط

راستے پر چلنے سے روکا نہ ہی اس کے شوہر نے اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کی۔ دونوں نے ضد میں رہ کر اپنی ازدواجی زندگی کو سوالیہ نشان بنا دیا۔

حسن آرا اور اس کے شوہر کا کردار محبت کرنے والے جوڑے کا ہے۔ حسن آرا کو بہت اچھے طریقے سے معلوم ہے کہ کس طرح شوہر کو قابو میں کرنا ہے۔ کس طرح اس کے غصے کو کم کرنا ہے اس کے انداز اپنے شوہر کے ساتھ خالص روایتی ناچنے والیوں جیسے ہیں۔ ٹھاکر اور اس کی بیوی کو اس کے کسی عمل سے کوئی مسئلہ نہیں بلکہ ان کے لیے یہ بات باعثِ سکون ہے کہ ان کا بیٹا غلط راہ پر نہیں چلا۔ ان کی بہو بیٹے کو خوش رکھتی ہے جیسے میاں بیوی کا یہ مکالمہ۔

"ماں: یہ بہو ہم بیاہ کر لائے ہیں۔

ٹھاکر: ہاں یہ سجاول والی!

ماں: اسی کی بات کر رہی ہوں

باپ: ہاں یہ محسن لغاری کی بیٹی ہے۔

ماں؛ بیٹی تو اسی کی ہے، مگر گڑبڑ لگ رہی ہے۔

ماں: اوں بھئی اب خون کی گڑبڑ تو اللہ ہی جانے

ماں: یہ ہر وقت گانے بجانے کی باتیں کرتی ہے کمرہ بند کر کے سجاول کو ناچ کر بھی دکھاتی ہے۔

باپ: تو بھئی کیا ہے، اب بہو ہے اس گھر کی عزت ہے۔

ماں: یہ تو ہے بڑا پیار کرتی ہے مجھ سے، بڑا سج دھج کے رہتی ہے اور اپنا سجاول بھی اس سے خوش ہے۔"(۲۵)

ماں، حسن بانو کی حرکتوں سے پریشان رہتی ہے۔ اس کے نزدیک اتنا سج سنور کر رہنا اچھی بات نہیں بلاول حسن بانو کو نشے کی حالت میں یاسمین سمجھ بیٹھتا ہے۔ جس سے حویلی میں طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسلام کے عائلی قوانین میں یہ بات بھی باور کروائی جاتی ہے کہ پردہ عورت پر واجب ہے۔ اسی پردے کی وجہ سے مرد ہو یا عورت شر سے بچ سکتی ہے۔ حسن بانو کا شوہر بھی اس واقعے پر برہمی کا اظہار کرتا ہے۔ مگر وہ

اپنے شوہر کو سمجھا دیتی ہے مگر ساس کو قائل نہ کر سکی۔ اس واقعے کے بعد ماں کا یہ مکالمہ اس کے ڈر کو ثابت کرتا ہے۔

"ماں اندھیرا ہو جائے تو گھر اور کوٹھے میں فرق ختم ہو جاتا ہے۔ مجھے تو اس حویلی کی دیواریں لرزتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، گھر کے ملازم دیواریں نہیں ہیں اگر انہوں نے کچھ کہا سنا، یا کہنا شروع کر دیا تو کس کس کے سامنے نگاہیں نیچی کرتے رہو گے۔"(۲۶)

حسن بانو کے نزدیک یہی زندگی کا حسن ہے۔ وہ شوہر سے محبت کرتی ہے اور اسی محبت کا اظہار وہ کرتی رہتی ہے۔ "حسن بانو: آج میں کھانا آپ کو اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔"(۲۷)

حسن بانو کا کردار ایک لالچی لڑکی کا کردار ہے جسے دولت کی چاہ ہے۔ اس کے نزدیک دولت سب سے زیادہ ضروری ہے۔ وہ اپنے شوہر کو قابو میں کرنے کے لیے ہر حد پار کر جاتی ہے۔ وہ یاسمین پر نظر رکھنا شروع کر دیتی ہے۔ یاسمین کا کردار جو ایک غمگین لڑکی کا کردار ہے۔ شوہر کے مر جانے کے بعد وہ اور تنہا ہو جاتی ہے۔ وہ روایتی گھرانے کی عورتوں کی طرح جیٹھانی پر شک کرتی ہے۔ وہ ماں کو بتاتی ہے کہ ملازموں کا حویلی میں آنا جانا کم کر دیا جائے۔ حسن بانوں یوں کہتی ہے

"ماں جی: اس حویلی میں بہت سے تہہ خانے ہیں اور راہ داریاں ہیں چور دروازے ہیں۔

ماں: وہ تو ہے پھر

حسن بانو: آنکھ تو کھلی رکھنی پڑتی ہے نہ ماں جی!"(۲۸)

یاسمین اپنے نفس سے مجبور ہو کر ملازم سے ناجائز تعلق بناتی ہے۔ وہ اس بات کو چھپانے کے لیے شمائل کا سہارا لیتی ہے۔ جب اسے ماں بننے کی خبر ملتی ہے تو شمائل کے آگے ہاتھ جوڑتی ہے۔ شمائل اسے اپنا نام دینے کا فیصلہ کرتا ہے مگر اس کے اندر بھی ٹھاکر خاندان کی سوچ موجود ہوتی ہے۔ وہ بھابی سے باز پرس کرتا اور اسے اس شخص کا نام بتانے کا کہتا ہے مگر یاسمین ملازم "جانو" کو بچانے کے لیے اس کا نام نہیں بتاتی۔ جھوٹ اور فریب زیادہ دیر نہیں چھپتے۔ ایسا ہی یاسمین کے ساتھ بھی ہوا۔ جب وہ بچے کو جنم دیتی ہے تو بچہ ملازم کی شکل وصورت کا پیدا ہوتا ہے اور یوں اس کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اسے سنگسار کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

بقول ڈراما نگار:

"میرے بے شمار ڈراموں میں لڑکیوں کے لیے پیغام ہے۔ "پیاس"، "نجات"، "غلام گردش"، "چاند گرہن"، "بول میری مچھلی"، "دل تو بھٹکے گا"، "تم ہو کہ چپ" وغیرہ میں لڑکیوں کو درپیش مسائل ہی بیان کیے گئے اور ان کو زندہ رہنے کے لیے پاؤں پر کھڑے ہونے کا پیغام دیا ہے۔"(۲۹)

شائل انسانیت کے ناطے اور اپنی بھابی کی تکلیف کو سمجھتے ہوئے اس کی جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر یہاں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ باشعور ہونے کے باوجود ان کے اندر دقیانوسی سوچ موجود ہے۔ افرادِ خانہ اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ اس کو طعنے دیے جاتے ہیں اور اسے اور اس کے بچے کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

حسن بانو لالچ میں آ جاتی ہے۔ وہ اسے بچانے کے لیے اس کی دولت اپنے نام کروا لیتی ہے۔ وہ اپنی جیٹھانی اور اسکے ناجائز بچے کو حویلی سے بھگانے میں مدد کرتی ہے۔ حسن بانو اس بات کا فائدہ اٹھاتی ہے، مگر اس کا یہ لالچی عمل کسی کو بھی پسند نہیں آتا۔ شائل کی سرکشی پر ٹھاکر کو فالج کا اٹیک ہو جاتا ہے۔ حسن بانو کی تقدیر اس وقت پلٹتی ہے، جب ماں اپنے فیصلے کو تکمیل تک پہنچاتی ہے اور حسن بانو کو حویلی سے بے دخل کر دیتی ہے۔ وہ بے بس ہو جاتی ہے۔ اس کا شوہر خاموش تماشائی بن کر باپ کے فیصلے کو مقدم جانتا ہے۔ اس کے شوہر کا یہ مکالمہ دونوں کی سوچ اور خیال کو واضح کرتا ہے۔

"سجاول: تھوڑا سا لالچ تھوڑی سی چالاکی اور تھوڑی سی سازش جب کسی بڑی حویلی میں پلنے لگ جائے، تو اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ تم نے یہ سب کچھ تھوڑا تھوڑا تو کیا ہے۔"(۳۰)

حسن بانو پر سے اس کے شوہر سجاول کا بھروسا اور اعتماد اس وقت اٹھ جاتا ہے۔ جب وہ دولت کی لالچ میں اپنی بھابھی کو گھر سے بھگانے میں مدد کرتی ہے اور اپنے شوہر کو بھی اسی بات کی تلقین کرتی ہے کہ دولت ہو تو سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ اس کے شوہر کے نزدیک اس کا یہ عمل قابلِ معافی نہیں ہے، وہ باپ اور گھر کی محبت میں اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ حسن بانو کا یہ عمل یاسمین کی جان بچانے کے لیے تھا۔ حسن بانو

اس کے گھر سے نکلنے سے انکاری ہو جاتی ہے اس کا ماننا ہے کہ یہی اب میرا گھر ہے۔ لڑکیاں شادی کے بعد شوہر کے گھر کو ہی اپنا گھر سمجھتی ہیں وہ اسے یہ بات یاد دلاتی ہے کہ "حسن بانو: آپ جیسوں کے گھر سے تو بیویاں کفن میں واپس جاتی ہیں۔"(۳۱)

دنیا کا قانون ہے کہ ایک کے بعد دوسرا پہلے کی جگہ لینے آ جاتا ہے۔ یہی ماں کے ساتھ بھی ہوا وہ ملکہ بن کر ساری حویلی کا نظام دیکھتی رہی۔ مگر جب دوسرے بیٹے کی بیوی آتی ہے تو بیٹا ماں سے حویلی کی چابی حسن بانو کو دینے کا کہتا ہے۔ ماں کو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اپنی جگہ کسی دوسرے کے لیے خالی کرنی ہے تاکہ دوسری آگے آجائے۔ خاندان کے افراد کی عادات میں خرابی حویلی کا ماحول خراب کرنے کی وجہ بنتی ہے۔

مادی وسائل کی زندگی میں کمی نہیں مگر پیار، محبت، اعتبار اور احساس کی کمی ہے۔ کہانی کا ایک کردار اس عادت کی خرابی سے بچا ہوا ہے۔ جس سے اس کہانی میں تجسس کی بنیاد پڑتی ہے۔ **شمائل** جو اعلی تعلیم یافتہ اور شہر کا پروردہ ہے۔ اس کی سوچ اور خیالات نہایت عمدہ اور خاندان کے دوسرے افراد سے مختلف ہیں۔ تینوں بیٹوں کی پرورش ٹھاکر اور اس کی بیوی نے کی مگر تینوں کی عادتوں میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ ایک عیاش، دوسرا بیوی کا غلام اور تیسرا عمدہ سوچ کا مالک ہے۔ اس کے نزدیک شادی صرف دو لوگوں کا رشتہ نہیں۔ وہ اپنے باپ سے شادی کے موضوع پر مکالمہ کرتا ہے تو اس کی اور اس کے باپ کی سوچ واضح ہو جاتی ہے۔ باپ اس کو اپنی پسند کو شادی کا بھی مشورہ دیتا ہے۔

"ٹھاکر: پتر شہر میں کسی کو پسند کرتے ہو تو بعد میں شہر میں اس سے شادی کر لینا ہمارے بزرگوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔"(۳۲)

ٹھاکر کے نزدیک زائد شادیاں کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ اس کے نزدیک ایک خاندانی بیوی رکھو اور باقی شہر میں آپ جیسے چاہو زندگی گزار لو۔ شمائل کا کردار اپنے گھر میں ایک مثبت کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے گھر کے معاملات کو سلجھانے کی اس وقت کوشش کرتا ہے جب باپ اپنے دوسرے بیٹے پر گولی چلا دیتا ہے۔ باپ کا ماننا تھا کہ یہ دولت کی لالچ میں آ گیا ہے۔ اس نے دولت کے لیے اپنی بھابی کو گھر سے بھگا دیا ہے۔ ان کے گھر کا ماحول اس وقت جذباتیت سے پُر ہوتا ہے جب باپ بیٹے پر گولی چلاتا ہے۔ ٹھاکر فالج

کے عارضے میں مبتلا ہے اور بستر پر ہے۔ باپ کا ماننا ہے کہ بیٹے نے اس کی حکم عدولی کی ہے۔

وہ اپنے تیسرے بیٹے سے اس لیے ناراض ہے کہ وہ یاسمین کو گھر سے بھگا کر لے گیا ہے اور اسے باعزت مقام دے کر اپنے ساتھ رکھ رہا ہے۔ ٹھاکر کے نزدیک عورت کی غلطی کی کوئی معافی نہیں، وہ صرف سزا کی مستحق ہے۔ شمائل اپنے گھر کے خراب ماحول کو صحیح کرنے کی اس وقت کوشش کرتا ہے جب اسے اسکی بھابھی کے ناجائز تعلق کی خبر ملتی ہے۔ وہ اپنی بھابھی کے ساتھ ہو جاتا ہے اور اس کی کیفیت اور مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے نکاح کر لیتا ہے۔ گھر میں تناؤ کی کیفیت برقرار رہتی ہے مگر شمائل اپنے زورِ بازو سے یاسمین کو حویلی سے نکال کر شہر لے جاتا ہے۔ یاسمین اور شمائل کے آخری قسط کی مکالمے شمائل کی محبت کو واضح کرتے ہیں۔ شمائل جو کہ اپنی دوست کا ڈسا ہوا ہے۔ اس کی دوست نے اس سے بے وفائی کی اور شادی کے وعدے کر کے کسی اور سے ناجائز تعلق قائم کر لیے۔ شمال کو اس بات کی خبر ہو جاتی ہے اور وہ اس بات کا بدلہ لینے کے لیے اسے چھوڑ دیتا ہے۔

اس گھرانے کے لوگ دولت ہونے کے باوجود ہوس اور لالچ کا شکار ہیں۔ جاگیروں کے مالک ہونے کے باوجود جائیداد کے پیچھے ایک دوسرے سے نفرت کر رہے ہیں۔ اس میں قصور باپ کی سوچ کا ہے۔ اس نے اولاد میں جیسی سوچ ڈال دی ویسی پروان چڑھتی گئی۔ باپ جو فیصلہ کرتا ہے سب کو اس پر عمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ باپ اور ماں دونوں نے بیٹوں میں دولت کا خمار بھر دیا ہے مگر تیسرا بیٹا تعلیم کے باعث ہوس اور لالچ سے پاک ہو کر ہمدردی، محبت اور احساس کا رشتہ نبھاتا ہے۔

"بول میری مچھلی"

"بول میری مچھلی" ڈرامے کے کردار معاشرے میں موجود عام کردار ہیں۔ ان کرداروں میں ہمیں عام سماجی حالات و واقعات ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کرداروں کی زندگیاں عام معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی عائلی زندگی عام مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ خاندان جمہوری خاندان کی ذیل میں آتا ہے۔ ان کرداروں کے ذریعے ہمیں متوسط طبقے کے مسائل بھی نظر آتے ہیں۔ اس ڈرامے کے کرداروں کو اگر عائلی زندگی کے تناظر میں پرکھا جائے تو یہ ایک عام گھرانے کی کہانی ہے۔ اس گھر کے افراد عام طبقے سے تعلق رکھتے

ہیں۔ پروفیسر وحید ایک جونیئر کلرک اور ریٹائر ملازم ہے۔ وہ چار بیٹیوں کا باپ ہے اور گھر کی تمام ذمہ داریاں اس پر ہیں۔ وہ اپنے گھر کا واحد کفیل ہے جس کے باعث وہ بہت زیادہ مسائل کا شکار ہے۔ اس نے اپنے آپ کو مضبوط بنایا ہوا ہے۔ اس گھر کے سربراہ کا کردار خاصا توجہ طلب ہے کہ وہ کیسے سیدھا چلتا ہوا غلط فیصلے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کہانی میں ہمیں سربراہ شریف النفس شخص دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی صاف ماحول میں گزاری ہے۔ بیٹیوں کی پرورش کر کے انھیں جوان کیا اور ان کو اپنا بیٹا سمجھ کر آزادی دے دی۔ اس نے اپنی بیوی اور اولاد دونوں کو حرام رزق نہیں کھلایا پاک صاف زندگی مہیا کی ہے۔ اس نے گھر میں ہر آسائش مہیا نہیں کی مگر حلال ہی کما کر لایا۔ اس کے گھر والوں میں صبر، احساس، استقامت، پیار اور محبت شامل ہے۔ پروفیسر وحید اپنی بیوی سے پیار محبت سے پیش آتا ہے۔ پروفیسر وحید اور اس کی بیوی میں کسی قسم کی لڑائی یا چپقلش نظر نہیں آتی۔ دونوں اپنی اپنی زندگی گزار کر مطمئن ہیں۔ انہوں نے بے شک بہت امیرانہ زندگی نہیں گزاری مگر خوش اور مطمئن زندگی ضرور گزاری ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا احساس کرتے اور ایک دوسرے کی پریشانیوں کو سمجھتے ہوئے حل تلاش کرتے ہیں۔ پروفیسر وحید کی بیوی قناعت پسند، صابر اور شاکر عورت ہے۔ لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے شوہر کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ ان دونوں میاں بیوی میں دولت کی ہوس نہیں ہے۔ وہ ضروریات زندگی کے مطابق کماتے ہیں۔ ان کے اندر زیادہ کی ہوس نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی چار بیٹیوں کی پرورش بہت اچھے انداز میں کی مگر وہ بیٹیوں کو بیٹا ماننے کے چکر میں یہ بھول جاتے ہیں کہ باہر کی دنیا بہت ظالم ہے۔ اس کی بیٹیاں اپنے لاحاصل خوابوں کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ ان کو کام کے لیے گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ کہانی کے آغاز سے ہی کرداروں کی سوچ واضح ہو جاتی ہے۔ پہلی قسط کا منظر گھر کے ماحول کو اور زیادہ واضح کر دیتا ہے۔ عام سا ماحول جہاں لڑکیوں کی چہکار اور ہنسی موجود ہے۔ (لڑکیاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی ہوئی)

"سحاب: آگیا وہ شاہکار جس کا تھا ہمیں انتظار۔

رباب: دیکھو میرے ناول دے دو اور اگر رونیتا کی منگنی ٹوٹ گئی تو میں اگلی قسط میں جو ڑدوں گی پرامس اس میں میرا خط آیا ہو گا دیکھو۔

رباب: خط آیا ہے پھر تو میں سب سے پہلے پڑھوں گی ضرور پڑھوں گی۔

نورین:(نورین کمرے میں داخل ہوتی ہے) خوابوں میں رہنے والی لڑکیوں، خیالوں میں رہنا چھوڑ دیجیے۔

رباب: دیکھو تم اپنا لیکچر بعد میں دے دینا، یہ دے دو مجھے۔

نورین: آپی یہ خوابوں کا بستہ ہے please لڑکیوں کو یہ پڑھانا چھوڑ دیجیے۔

رباب: دیکھو کمزور آدمی کے پاس صرف خواب ہی ہوتے ہیں۔

نورین: ارے آپی آپ اپنے آپ کو اتنا کمزور کیوں سمجھتی ہیں، ذرا جم کے کھڑی ہوں آپ۔

سحاب: ہم لٹریچر والے ہیں ہم سے پنگا مت لے۔"(۳۳)

ان کے گھر کا ماحول تصنع بناوٹ سے پاک سادہ طرز زندگی لیے ہوئے ہے۔ جہاں نہ جھگڑے ہیں، نہ لڑائیاں، نہ روک ٹوک، نہ ہی بے جا آزادی ہے۔ ماں اپنی اولاد پر نظر تو رکھتی ہے۔ مگر جب اولاد جوان ہو جائے اور باہر کے ماحول کو سمجھ جائے تو اس کو اپنے آپ کو چھپانا بھی آ ہی جاتا ہے۔ ادھر بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کرداروں کے ذریعے ہمیں معاشرے کے مسائل اور ان کا شکار لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں کہ وہ کیسے اپنے آپ کو برباد کر کے زندگی ختم کر دیتی ہیں۔

اصغر ندیم سید کی یہ کہانی متوسط طبقے کے بہت سے مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ جہاں میاں بیوی اپنی زندگی اور اس بات سے مطمئن ہیں کہ انہوں نے اپنی اولاد کو اچھی زندگی دے دی ہے۔ ان کو ہر طرح کی آزادی دی ہے۔ انہیں اچھا طرزِ زندگی دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ پروفیسر کے نزدیک اس کی بیوی کا ساتھ اس کے لیے بہت پر سکون رہا ہے۔ اگر وہ باحوصلہ عورت بھی حالات سے ہار گئی تو وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ پروفیسر وحید اپنی بیوی سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

"پروفیسر وحید: آسیہ دیکھنا اگر تم نے بھی ہمت ہار دی تو میری تو کمر اور بھی ٹوٹ جائے گی تم ہی تو میرا سہارا ہو۔ میرے دکھوں اور میری خوشیوں کا حصہ ہو۔"(۳۴)

پروفیسر وحید اپنی بیوی کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی بیوی اس کے دکھ سکھ کی ساتھی ہے۔ ہر مشکل میں اس کے ساتھ ہے۔ ان کی زندگی اسی لیے مطمئن ہے کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے

کے دکھ کو سمجھتے اور ایک دوسرے کی پریشانیوں کو جانتے ہیں۔ پروفیسر وحید روایتی مردوں کی طرح اپنے فیصلے اپنے گھر والوں پر مسلط نہیں کرتا، دوسری طرف پروفیسر وحید کی بیوی آسیہ اپنے شوہر سے کسی بھی معاملے میں شکایت نہیں کرتی۔ اسی باعث دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں خوش ہیں۔ پروفیسر وحید کا نہایت مدبّرانہ اور ناصحانہ انداز اس وقت سامنے آتا ہے جب اپنی بیٹیوں کو تنبیہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"پروفیسر وحید: بیٹا میں اس بات کو برا نہیں سمجھتا اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کے اس دور میں لڑکیوں کو آزادی دینی چاہیے لیکن ایک حد تک اور ہو سکے تو بیٹا اس کا صحیح استعمال کرنا سیکھ لینا۔"(۳۵)

پروفیسر وحید اور اس کی بیوی پیار محبت سے رہ رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا اطمینان ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کی تربیت اچھے انداز میں کی ہے۔ ان کو اچھا ماحول فراہم کیا ہے بلکہ وہ اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو آزادی دینے کے باوجود اچھا ماحول فراہم کیا اور وہ کبھی بھی ان کے لیے باعثِ شرمندگی نہیں بنیں گی۔ ان کا طرزِ زندگی آرائش و زیبائش سے پاک ہے۔ پروفیسر وحید ریٹائرمنٹ کے آخری دن اپنی بیگم کو یوں ریٹائرمنٹ پارٹی کی روداد سناتا ہے۔

"بس تین چار تکبیریں ہوئیں ایک دوست نے نظم پڑھی، اے دوست الوداع، الوداع اے دوست! ایسے لگتا تھا جیسے میری موت کا مرثیہ پڑھا جا رہا ہے۔"(۳۶)

بیٹیوں کو تعلیم دلوائی گئی۔ جس کے بعد لڑکیاں خود دار ہو جاتی ہیں اور اپنی ذاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے چکر میں چھوٹی عمر میں کمانے لگ جاتی ہیں۔ جب وہ سماج کے گرداب میں پستی ہیں تو انہیں علم نہیں ہوتا کہ وہ کیسے دلدل میں پھنستی چلی جا رہی ہیں۔ پروفیسر وحید کی دو جڑواں بیٹیاں جو رسالوں میں کچھ نہ کچھ لکھ کر پیسے کماتی ہیں۔ دونوں ایک ہی شخص کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ دونوں میاں بیوی تربیت پر فخر کرتے ہیں اور اس بات سے مطمئن ہیں کہ ان کی اولاد کبھی کچھ غلط نہیں کر سکتی ہے۔ اسی یقین کے باعث وہ والدین کو کمزور سمجھ لیتی ہیں، اور ان سے کسی معاملے میں اجازت لینے کے بجائے اس کو صرف بتانے پر اکتفا کرتی ہیں۔ ماں ہمیں وفا شعار بیوی نظر آتی ہے جو اپنے شوہر کو طعنے نہیں دیتی ہے، بلکہ حالات پر صبر کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ بیٹی کے حادثاتی موت کے بعد پروفیسر وحید اور اس کی اہلیہ ایک دوسرے کو تسلی دیتے اور کہتے کہ ہیں

قسمت میں جو چیز لکھی تھی وہ ہمارے ساتھ ہو گی۔ماں اپنی بیٹی کا پردہ رکھتے ہوئے شوہر کو نہیں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔بیٹی کے مرنے کے بعد باپ ڈر اور خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور باقیوں کو آزادی دینے سے ڈرتا ہے۔بیوی اس کو یوں سمجھاتی ہے۔

"ماں: کیا ہوا ہے، کیا نہیں ہوا ہے، بھول جاؤں اسے مردوں کو معاف کر دیا کرتے ہے۔ سمجھو کسی نے اغوا کر لیا تھا گلا دبا دیا تھا قصہ ختم ہو گیا۔ دیکھو وحید الدین تمہارا مسئلہ لڑکیاں نہیں ہیں تمہارا مسئلہ پنشن ہے اور وہ ٹیوشن کے لڑکے ہیں جو پورے نہیں ہو رہے ہیں۔"(۳۷)

بیوی بیٹی کے ریڈیو میں کام کرنے کی طرفداری کرتی ہے تو شوہر اس کو تنبیہ کرتا ہے اور اس کو کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔بیٹی باغی ہو جاتی ہے لیکن وحید الدین کا یہ جملہ ہمیں بتاتا ہے کہ سانپ کا ڈسّا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔"بات بیٹیوں کی نہیں، دودھ سے نہلا کر بھی بیٹیوں کو باہر بھیجو گی، تو چھینٹا باہر سے ہی پڑے گا۔"(۳۸)

نورین کا کہنا ہے کہ باپ سے کیا پوچھنا ہے، کمزور لوگوں سے مشورہ نہیں لیا جاتا۔ ادھر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ بیٹیاں پروفیسر وحید کے ہاتھ سے نکل چکی ہیں۔ ان کے نزدیک پروفیسر وحید کم عقل اور کمزور انسان ہے جو ان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے ان کو خود ہی خود دار ہونا پڑے گا اور خود ہی پیسے کمانے پڑیں گے مگر وہ یہ نہیں جانتی ہیں، کہ باپ کا یہ ڈر اور خوف صحیح ہے۔بیٹیاں باپ کو کمزور انسان سمجھ کر پسِ پشت ڈال دیتی ہیں۔ اسی گھر میں جب نظر دوڑائی جائے تو پیسے کے پیچھے بھاگنے والی لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے نزدیک پیسہا کمانا سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ سحاب اور رباب کا کردار اس کہانی میں اہمیت کا حامل ہے۔ دونوں ایک ہی شخص کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ان کا کردار رومانویت کا عنصر لیے ہوئے ہے ۔ محض پیار، محبت کی باتوں سے اسیر ہو جانے والی لڑکیاں ہی عشق میں گرفتار ہو کر اپنی جان گنوا بیٹھتی ہیں جبکہ دوسری بیٹی اسی شخص سے شادی کر کے اپنی زندگی کو عذاب بنا لیتی ہے۔ ادھر ماں کا کردار ایسا ہی ہے جو ایک عام روایتی ماں کا ہوتا ہے۔ جو اپنی اولاد کی غلطیوں پر پردہ ڈال لیتی ہے مگر اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہی غلطی اس کی دوسری اولاد بھی کر سکتی ہے۔ ماں نے رباب کے ناجائز تعلق پر تو پردہ ڈال دیا مگر ماں اور باپ دونوں اپنی بیٹی کو معصوم سمجھتے اور کہتے ضرور کسی اور نے اسے ورغلایا ہو گا۔ ماں باپ کا اپنے بچوں پر اندھا اعتماد اور

بھروسا نظر آتا ہے۔ آرام کے چکر میں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی بیٹی کہاں جا کر پیسا کمارہی ہے۔ رباب تو مر جاتی ہے مگر اپنے پیچھے ایک نئی کہانی کو جنم دے دیتی ہے۔ سحاب کے ذہن پر مشہور ہونے کی دھن سوار ہوتی ہے۔ وہ ریڈیو سینٹر میں کام تو کرتی ہے، مگر اس کا مقصد ریڈیو سے نکل کر ٹی وی تک جانا ہوتا ہے۔ اس گھر میں رشتوں کا احترام، پیار، خلوص، قربانی سب کچھ نظر آتا ہے مگر غلط فیصلوں کے باعث افراد خانہ اپنی زندگی کو مزید مشکل بنالیتے ہیں۔

پروفیسر وحید ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی پینشن کے لیے در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے کہ میری بیٹیوں کو پیسے نہ کمانے پڑیں۔ جب اس کی پنشن بحال ہو جاتی ہے تو گھر میں آکر بڑی خوشی سے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ آج خوشی کا دن ہے کیونکہ ایک عام متوسط اور سفید پوش آدمی کے لیے سب سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اس کو رزق حلال ملنا شروع ہو گیا ہے۔

"پروفیسر وحید: میری پنشن ریلیز ہو گئی ہے اب بتاؤ اپنی بیٹی کی شادی کتنی دھوم دھام سے کرنا چاہتی ہو۔"(۳۹)

پروفیسر وحید اپنی بیٹیوں کی شادی کا فیصلہ خود نہیں کرتا بلکہ ان کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیتا ہے اور ان کی شادیاں ان کی مکمل رضا مندی سے کرواتا ہے۔ سحاب بے شک مجاز کو خود پسند کرتی ہے مگر اپنے باپ کی رضامندی سے اس شخص سے رشتے کے لیے ہاں کرتی ہے۔ ایسا ہی ہمیں ماہین کے رشتے کے وقت نظر آتا ہے، کہ کیسے ماں اپنی بیٹی سے اس کی رضامندی پوچھتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ تمہارا باپ مجبور ہے کہ تمہاری شادی جلدی کر دی جائے تاکہ تم بے بسی کی زندگی نہ گزارو۔

"باپ، پروفیسر وحید: سحاب بیٹی کیا تم مجھے اجازت دو گی۔

سحاب: جی ابّا

باپ: تو پھر میرا مذہبی فرض بنتا ہے، کہ تم سے پوچھوں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں

سحاب: مجھے کیا اعتراض ہونا ہے آپ جو چاہتے ہیں جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہو گا۔"(۴۰)

اس گھرانے میں ہمیں مکمل طور پر مشرقی ماحول نظر آتا ہے۔ اسی گھرانے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ متوسط اور سفید پوش آدمی کی کیا مشکلات ہوتی ہیں اور وہ کس طرح سے اپنی خواہشوں کو مار کر زندگی

گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کہانی کے اختتام تک ہمیں یہ گھرانہ خوش و خرم نظر آتا ہے۔ سحاب جو ایک غلط بندے سے شادی کر لیتی ہے مگر اس سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ نورین جو پیسہ کمانے کی دوڑ میں بہت آگے بہت پستی میں گر جاتی ہے۔ وہ بھی اپنے باپ سے معافی مانگتی ہے اور عمران کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ ماہین جس کی شادی ایک غلط گھرانے میں ہو جاتی ہے جہاں بیٹا اور سسر ایک ہی جیسے کردار کے مالک ہوتے ہیں وہاں اس کی ساس اس کی مدد کرتی ہے۔ اس کی مدد کے دوران وہ اسے پڑھائی کے لیے دوسرے ملک بھیجنے پر راضی ہو جاتی ہے۔ یوں کہانی کے اختتام میں ایک ساتھ خوشیاں مناتے ہوئے ایک ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ہمیں یہ بکھرا ہوا گھرانہ دوبارہ سے مکمل نظر آنے لگتا ہے۔

اسی کہانی میں ایک اور بکھرا ہوا گھر نظر آتا ہے جو کہ مجاز صدیقی کا ہے۔ مجاز صدیقی ایک غلط سوچ ،غلط ذہنیت اور غلط عمل کا حامل بندہ ہے۔ جو شادی شدہ اور ایک پانچ سالہ بیٹی کا باپ ہے۔ اس کے نزدیک لڑکی ایک ٹشو پیپر کی طرح ہے۔ وہ لڑکی کو استعمال کر کے پھینک دیتا ہے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ شاعر، مصنف اور چھاپہ خانے کا مالک ہے، مگر اس کا پسندیدہ مشغلہ نوخیز کلیوں کو مسل کے پھینک دینا ہے۔ وہ بہت سی لڑکیوں سے ان کی معصومیت چھین کر انہیں تڑپنے اور مرنے کے لیے پھینک دیتا ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی کامیاب ازدواجی زندگی نہیں ہے بلکہ دونوں میاں بیوی میں علیحدگی ہو چکی ہے۔ بیوی اس کی غلط حرکتوں کے باعث اس سے الگ ہو جاتی ہے اور کسی دوسری لڑکی کو اس کے کردار کے بارے میں یوں بتاتی ہے۔

"میں نے اسے چھوڑا ہے وہ ایک بہت گھٹیا آدمی ہے۔ بہت خوبصورت باتیں کرتا ہے۔
اس میں ایک ایسی کشش ہے لڑکی چاہے جیسی بھی ہو ایک بار ضرور دیکھتی ہے۔ بس پھر
اس کا کام شروع ہو جاتا ہے، اور وہ پھر اس کو اپنے جال میں پھانس لیتا ہے۔"(۴۱)

مجاز صدیقی اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بجائے اپنے پیچھے خوار کرتا ہے۔ اسی بات سے مجبور ہو کر بیوی فیصلہ عدالت سے کروانا چاہتی ہے۔ میاں بیوی کا یہ مکالمہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ آزادی کی خاطر اپنی بیٹی کو رکھنے کے لیے تیار نہیں بلکہ اپنی بیٹی کا خرچہ دینے کو تیار ہے۔

"یہ لو اپنی بیٹی یہ اب تمہاری ذمہ داری ہے مجھے یہ ہتھکڑی نہیں چاہیے مجھے جاب کرنی
ہے، کچھ بننا ہے مجھے۔

مجاز: رکو اگر تم اپنی بچی کو افورڈ نہیں کر سکتی تو میں اس کا خرچہ دینے کے لیے تیار ہوں۔
اس وقت تک جب تک عدالت کوئی فیصلہ نہیں کرتی کیونکہ یہ میری بھی تو بچی
ہے۔"(۴۲)

مجاز اپنی بیٹی کو رکھنے کو تیار نہیں ہے جبکہ دوسری شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ سحاب کو اپنی باتوں کے جال میں پھنسالیتا ہے۔ لڑکیاں اس کی شاعری پر مرتی اور اس سے آٹو گراف لینے کے لیے تڑپتی ہیں۔ لڑکیوں کا یہی طریقہ اس کے غلط انداز کو اور بڑھاوا دیتا ہے۔ سحاب اسی باعث اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ شادی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بہن کو موت کی دہلیز تک پہنچانے والا اس کا اپنا شوہر ہی ہے۔ جب سحاب کو علم ہو جاتا ہے کہ مجاز صدیقی نے ہی اس کی بہن کا قتل کیا تو وہ اس سے اپنا رویہ بدل دیتی ہے۔ شادی کی رات لڑکی اپنے دل میں بہت سے خواب سجا کر پھولوں کی سیج پر شوہر کا انتظار کرتی ہے۔ وہ اس کے ارمانوں اس کی خواہشوں پر پورا نہیں اترتا تو اس کے لیے درد بن جاتا ہے۔ مجاز صدیقی نے بھی ایسا ہی رویہ اختیار کیا۔ سحاب جیسی حساس لڑکی کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے۔ مجاز کے پل پل بدلتے رویہ سحاب کو پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مجاز نے سحاب کی زندگی تو برباد کر ہی دی مگر اس کے پیروں میں اولاد کی زنجیر پڑ چکی تھی۔ اس کو فیصلہ کرنے میں اس لیے دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ عائلی زندگی میں صرف پیار، محبت کی باتوں کے بجائے اعتبار اور وفا بھی بہت ضروری ہے جس کے باعث زندگی سہل ہو جاتی ہے۔ جب سحاب کو یہ سب چیزیں میسر نہیں آتیں تو وہ اس سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ سحاب کا کردار بھی ایسا ہی ایک کردار ہے جس نے محبت تو کی مگر غلط بندے سے، اس نے بے اعتبار بندے کا اعتبار بھی کیا، اس سے وفا بھی کی اور اس کی اولاد کا احساس بھی کیا، مگر مجاز صدیقی اسے دھوکہ دیتا چلا گیا۔

ڈرامے کی اس کہانی میں ہمیں نسوانی کردار تکلیف میں نظر آتے ہیں، جبکہ مرد عیاشی کی زندگی گزارتا اپنے مقصد کو حاصل کرتا ہوا، عورتوں پر الزام لگاتا، انہیں برباد کر کے چھوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی سرشت میں رومانیت کا عنصر غالب ہے۔ بیوی سے مخاطب ہوتا ہے تو بڑے ہی رومانوی انداز میں مخاطب ہوتا ہے۔ اس کے لیے سحاب ایک نیا کھلونا ثابت ہوتی ہے۔

"مجاز: تو پھر کیا بات ہے جانِ جاناں!

آپ میرے ساتھ اس طرح کے لفظ استعمال نہ کیا کریں جن میں سے منافقت کی بو آ رہی ہو۔"(۴۳)

سحاب جیسی لڑکی جس کے نزدیک مادیت سے زیادہ رشتوں، اعتبار اور وفا کی اہمیت ہے، کو بہت جلد یقین ہو جاتا ہے کہ مجاز صدیقی نے اسے بے وقوف بنا کر اپنی زندگی میں شامل کر لیا ہے۔ مجاز صدیقی ہمیں اس وقت برباد ہوتا نظر آتا ہے جب اس کی پہلی بیوی اس سے بدلہ لیتی ہے، کیونکہ مجاز صدیقی نے اس کو یہ کہہ کر اپنے گھر سے نکالا تھا کہ تم غلط لڑکی ہو۔ کسی بھی عورت کے لیے یہ بات تازیانہ ثابت ہوتی ہے جب اس کے کردار پر انگلی اٹھائی جائے۔ مجاز صدیقی کی پہلی بیوی نے اس سے اس بات کا بدلہ لیا اور اسے عدالت تک لے کر گئی۔ اس پر قتل اور دھوکے کے مقدمے چلائے، اختتام میں اس سے یوں مخاطب ہوتی ہے۔

"میں یہاں تک تمہیں کیوں لائی ہوں تم نے مجھے کرپٹ کہا تھا نا اور تم اچھی طرح سے جانتے تھے کہ میرا کریکٹر کیسا تھا۔ عورت پر الزام لگانا بہت آسان ہوتا ہے، مگر اگر مرد کے منہ پر کالک لگی ہو تو کسی کو نظر نہیں آتی ہے۔"(۴۴)

اس ڈرامے میں دو قسم کی عائلی زندگی ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ ایک مطمئن پر سکون اور سادہ گھریلو زندگی، جبکہ دوسری سمندر کی لہروں کی طرح بل کھاتی تھرکتی، برباد ہوتی ہوئی زندگی۔ ایک گھر سحاب کا تھا جو تہی داماں رہی۔ اس نے محبت تو کی مگر اپنے محبوب کو پانے کے باوجود پل پل سسکتی اور مرتی رہی۔ اسی وجہ سے وہ ڈرامے کے اختتام پر طلاق کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کا یہ مطالبہ منظور بھی ہو جاتا ہے۔ مرد کی غلط فطرت عورت کے گھر کو برباد کر کے اس کی زندگی کو داغدار بنا دیتی ہے۔ اس ڈرامے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے مردوں کے غلط فیصلے، غلط رویے اور غلط حرکات و سکنات کے باعث گھریلو زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ مجاز صدیقی کا کردار ہمارے سامنے ہے۔ اس ڈرامے میں ہمیں عام معاشرتی گھرانہ نظر آتا ہے۔ جن کے حالات اور گھر کا ماحول ناظر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتا ہے۔

مرد اور عورت کا باہمی تعلق فطرت کا تقاضا ہے۔ ڈراما نگار اس میں پیار و خلوص کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے منتخب کردہ ڈراموں میں عائلی زندگی کی نمود ہے۔ نوجوان نسل پرانے رسم و رواج اور عائلی نظام سے بغاوت پر آمادہ ہے۔ ڈراما نگار پرانے فرسودہ عائلی نظام کے نقصانات کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے جس

میں لڑکے اور لڑکی کی مرضی کا قطعاً کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔

پاکستانی معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو مختلف ذاتوں، برادریوں اور قبائل کا مجموعہ ہے۔ اس میں، برادری اور علاقہ اپنے اپنے ماحول اپنے اپنے رسم و رواج کا پابند ہے۔ اس باب میں جہاں کرداروں کے عائلی مقام اور حالات کے بارے میں تجزیہ پیش کیا گیا وہی ان کی سوچ، فکر اور نفسیات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا۔ گھریلو مسائل نفسیاتی مسائل کو جنم دینے کا بڑا سبب بنتے ہیں۔ گھر میں معاشی مسائل زر میں کمی یا زیادتی دونوں ہی افرادِ خانہ کو نفسیاتی طور پر یشان کرتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مسائل بھی نفسیاتی ہیجان و مسائل کو جنم دیتے ہیں جس کے باعث نفسیات و عائلی زندگی کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

حوالہ جات

۱۔ ابوالکلام آزاد، مسلمان عورت، مکتبہ اشاعت القرآن، دہلی، ۱۹۶۳ء، ص:۶۱

۲۔ معیاد القرآن، ۱۹۶۹ء، ص:۶

3. The concise reference encyclopedia and dictionary New south wales: Bay books in Association with oxford university press P: 599

۴۔ المہاجر، عبدالحمید، اعلموانی فاطمہ، جلد:۶، ص:۱۲۴

۵۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از صباوحید، لاہور، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت: شام ۵ بجے

۶۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، خدا زمیں سے گیا نہیں ہے مورخہ ۱۸ دسمبر، ۲۰۱۸ء، قسط: ۶، منظر:۳، ایکٹ:۳

۷۔ ایضاً، قسط:۵، منظر: آخری منظر، ایکٹ:۳

۸۔ ایضاً، قسط:۸، منظر:۶، ایکٹ:۳

۹۔ ایضاً، قسط:۱۱، منظر:۶، ایکٹ:۳

۱۰۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، تم ہو کہ چپ، مورخہ ۱۲ دسمبر، ۲۰۱۸ء، قسط:۷، منظر ۶، ایکٹ:۳

۱۱۔ ایضاً، قسط:۳، منظر:۴، ایکٹ:۲

۱۲۔ ایضاً، قسط:۵، منظر:۹، ایکٹ:۲

۱۳۔ ایضاً، قسط:۳، منظر:۵، ایکٹ:۲

۱۴۔ ایضاً، قسط:۱۲، منظر:۱۰، ایکٹ:۴

۱۵۔ ایضاً، قسط۱۲، منظر:۱۱، ایکٹ:۴

۱۶۔ ایضاً، قسط:۳، منظر:۱، ایکٹ:۲

۱۷۔ ایضاً، قسط:۱، منظر:ابتدائیہ، ایکٹ:۱

۱۸۔ ایضاً، قسط:۵، منظر:۹، ایکٹ:۲

۱۹۔ ایضاً، قسط:۱۸، منظر:۴، ایکٹ:۵

۲۰۔ ایضاً، قسط:۲۰، منظر:۴، ایکٹ:۵

۲۱۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، دل تو بھٹکے گا، مورخہ ۱۰، مئی، ۲۰۱۸ء قسط:۱، منظر:۴، ایکٹ:۱

۲۲۔ ایضاً، قسط:۲۱، منظر:۴، ایکٹ:۱

۲۳۔ ایضاً، قسط:۲، منظر:۳، ایکٹ:۱

۲۴۔ ایضاً، قسط:۲، منظر:۷، ایکٹ:۱

۲۵۔ ایضاً، قسط:۳، منظر:۹، ایکٹ:۲

۲۶۔ ایضاً، قسط:۳، منظر:۴، ایکٹ:۲

۲۷۔ ایضاً، قسط:۳، منظر:۵، ایکٹ:۱

۲۸۔ ایضاً، قسط:۴، منظر:۶، ایکٹ:۳

۲۹۔ اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از صبا وحید، لاہور، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت ۵ بجے

۳۰۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، دل تو بھٹکے گا مورخہ ۱۰، مئی، ۲۰۱۸ء، قسط:۱۵، منظر:۱۳، ایکٹ:۵

۳۱۔ ایضاً، قسط:۱۵، منظر:۱۳، ایکٹ:۵

۳۲۔ ایضاً، قسط:۴، منظر:۴، ایکٹ:۳

۳۳۔ اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، سکرپٹ، بول میری مچھلی، مورخہ ۱۰، ستمبر ۲۰۱۸ء، قسط:۱، منظر:۱، ایکٹ:۱

۳۴۔ ایضاً، قسط:۷، منظر:۶، ایکٹ:۲

۳۵۔ ایضاً، قسط:۵، منظر:۴، ایکٹ:۲

۳۶۔ ایضاً، قسط:۱، منظر:۲، ایکٹ:۱

۳۷۔ ایضاً، قسط:۱۰، منظر:۳، ایکٹ:۳

۳۸۔ ایضاً، قسط:۱۱، منظر:۴، ایکٹ:۳

۳۹۔ ایضاً، قسط:۱۸، منظر:۲، ایکٹ:۴

۴۰۔ ایضاً، قسط:۱۸، منظر:۳، ایکٹ:۴

۴۱۔ ایضاً، قسط:۱۷، منظر:۴، ایکٹ:۴

۴۲۔ ایضاً، قسط:۲۵، منظر:۴، ایکٹ:۵

۴۳۔ ایضاً، قسط:۱۹، منظر:۱، ایکٹ:۴

۴۴۔ ایضاً، قسط:۲۸، منظر:۷، ایکٹ:۵

باب پنجم:

مجموعی جائزہ نتائج اور سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ

معاشرتی عمرانیات کا اصول ہے کہ ہر پرانا نظام نئے نظام کے لیے جگہ خالی کرتا ہے۔ بعض پرانے معاشرتی اور تہذیبی نظام نئے معاشرے میں بھی زندہ رہتے ہیں جب کہ اکثر نظام کہنہ کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ جب تک معاشرے کا تصور زندہ ہے تب تک ایسا ہوتا رہے گا اور یہ تاریخی اقدار ایسے ہی چلتی رہیں گی۔ اس تغیر و تبدل سے کوئی نہ کوئی تحریک اور رجحان ایسا نہیں ہے جو متاثر نہ ہوا ہو۔ اسی طرح ادب میں تبدیلی لانے کے لیے ادب کو بھی نئے نئے تجربات کرنے پڑتے ہیں۔ تاریخی ڈرامہ نگاروں کے ہاں جیسے ڈرامے نظر آتے ہیں وہ جدید ڈرامہ نگاروں کے ہاں ردوبدل کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ حقیقت ہی یہی ہے کہ قدیم آثار پر ہی نئی عمارت استوار کی جاتی ہے۔ اردو زبان بادشاہی سلطنت میں پلتی اور برٹش گورنمنٹ کے زیرِ سایہ تربیت حاصل کرتے ہوئے وجود میں آئی۔ اس نے کئی دوسری زبانوں کی مدد سے نشوونما پائی اور آج اردو دنیا کی بڑی زبانوں میں ہے۔ اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے بہت کم وقت میں ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے مختلف اصناف ادب کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ یہی سے ہمیں ڈراما بھی دکھائی دیتا ہے۔ ڈراما اصطلاح میں اس کلام کو کہتے ہیں جو پیش کیا جائے یا کر کے دکھایا جائے، وہ جو ہمیشہ تہذیب اخلاق یا اصلاح تمدن کا پہلو لیے ہوئے ہو۔ ٹریجیڈی کا تعلق نفسِ انسان زندگانی اور زمانے کے نشیب و فراز سے ہوتا ہے انگریزی اور سنسکرت ڈراموں کی تقلید میں اردو زبان میں بھی ڈرامے لکھے گئے بہت سے ڈرامے ترجمہ بھی ہوئے ابتدا میں ڈراما میں کوئی خاص ترقی نہ ہوئی تھی اس کے کردار بھی تمدنی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اسٹیج کی آرائش و زیبائش کو بڑھاتے ہوئے ڈرامے نے ترقی کر لی۔ اس میں نہ صرف اسٹیج کو خوبصورت بنایا گیا بلکہ منظر ماحول کرداروں میں بھی بہتری لائی گئی۔ آج اردو ڈرامے نے اتنا عروج حاصل کر لیا ہے، کہ وہ عالمی ڈراموں کے ساتھ کھڑا ہو سکتا ہے۔

ڈرامہ یونانی لفظ **ڈراؤ** سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی "کر کے دکھانے" یا "دکھائی ہوئی چیز" کے ہیں۔ چھٹی صدی قبل مسیح سے دور حاضر تک ڈرامے کی تاریخ ڈرامے کی اقدار اور روایات کی ایک لمبی داستان نظر آتی ہے۔ ادب کی تمام اصناف نے ہر جگہ الگ الگ زمانوں میں پرورش پائی آج یہ تمام اصناف اردو زبان کا حصہ ہے۔

ڈرامے کے اہم لوازمات میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل کردار ہیں۔ جس کے باعث ڈراما تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ کردار کسی بھی کہانی کی جان ہوا کرتے ہیں۔ ڈراما نگار کے تخلیق کردہ کردار انسانی زندگی کے قریب ہوتے ہیں۔ یہ عام انسانوں جیسے ہوتے ہیں اور ان سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ ادب میں کردار نگاری کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ ادب کی دنیا میں ایسے بہت سے کردار تخلیق کیے گئے جنہوں نے آفاقی شہرت حاصل کی۔ اسی باعث بہت سے کردار آج تک زندہ و جاوید ہیں۔

اصغر ندیم سیّد نے بھی اپنی فکری اور نظریاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عمدہ کردار اور ڈرامے تخلیق کرتے ہیں۔ ڈراما ٹیلی ویژن نشریات کا سب سے مئوثر حصہ ہے۔ ٹیلی ویژن کی تکنیکی ترقی کے ساتھ ساتھ ڈراما بھی ترقی کر رہا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ڈرامے نے ساری دنیا میں نام کمایا ہے اور ایک دور ایسا بھی آیا کہ پاکستان میں ڈراما ٹیلی ویژن کی آبرو بن گیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے شروع میں جن لوگوں نے لکھا یا جن کی کہانیوں کو ڈرامے کا حصہ بنایا گیا ان میں امتیاز علی تاج، رفیع پیرزادہ، ضیاء سرحدی، جاوید اقبال، راجہ فاروق علی خان، انتظار حسین، عابد علی عابد، حکیم احمد شجاع، صفدر میر، سلیم احمد اور ریاض فرشوری جیسے نامور ادیب شامل ہیں۔ بعد میں پی ٹی وی لاہور سینٹر سے ادیبوں کی ایک نئی ٹیم شامل ہوئی جن میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انور سجاد، کمال احمد رضوی، نصیر انور، منو بھائی، اطہر شاہ خان، آغا ناصر، سلیم چشتی، ذاکر حسین، مختار صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔ ٹیلی ویژن پر موضوعاتی Thematic ڈراما لکھنے کا آغاز ابتدا ہی سے ہو گیا تھا۔ موضوعاتی ڈراموں میں عتیق اللہ شیخ کا "خون کے رشتے" زاہدہ حنا کا "سلطان محمود غزنوی"، منو بھائی کا "سلطان سارنگ"، شفیع ایوبی کا "سلطان محمد فاتح"، اصغر بٹ کے "جب پہلی دیوار گری" اور "باپ بیٹا اور سلطنت"، احمد ندیم قاسمی کا "شکست اور فتح"، سلیم احمد کا "۱۸۵۷ء"، بانو قدسیہ کا "انکشاف" جس کا پس منظر کشمیر کی تحریک آزادی ہے اور انتظار حسین کا "محبت خان" مشہور ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران مختصر دورانیہ کے

کھیل پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ امجد اسلام امجد کے ڈراما "وارث" نے ٹیلی ویژن پر ایک نئے کلچر کو متعارف کرایا۔ بدترین آمریت کے باوجود جاگیر داریت کے خلاف ٹیلی ویژن نے اچھے ڈرامے پیش کیے۔ امجد اسلام امجد کے ساتھ **اصغر ندیم سید**، نور الہٰدی شاہ، عبد القادر جونیجو، عطاالحق قاسمی، ڈاکٹر ڈینس آئزک، فضل حسین صمیم اور یونس جاوید جیسے نامور ادیبوں نے ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے لکھنا شروع کیے۔

گذشتہ چند سالوں سے اردو ڈرامے پر چھائی رہنے والی شخصیتوں میں سے ایک نام پروفیسر اصغر ندیم سیّد کا بھی ہے۔ دورِ حاضر میں میڈیا کی دنیا میں ابھر کر سامنے آنے والے ڈراما نگار اصغر ندیم سید کا نام بہت نمایاں ہے۔ پروفیسر اصغر ندیم سیّد ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، آپ اردو ادب کے معتبر استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب ڈرامہ نگار بھی ہیں، صحافی، شاعر، افسانہ نگار اور ناول نگار بھی ہیں۔ اصغر ندیم سیّد کی علمی وادبی کار گزاریاں کم و بیش تیس سالوں پر محیط ہیں، لیکن ادب میں جس شعبے سے ان کی شناخت قائم ہوتی ہے، وہ ڈراما نگاری ہے۔ اصغر ندیم سیّد نے شاعری، نثر، کالم، تینوں میں طبع آزمائی کرتے ہوئے ایک منفرد نام بنایا ہے۔ ان کا شمار جدید ڈرامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی تلخیوں اور حقیقتوں سے منہ نہیں موڑتے بلکہ ان کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور نثر میں ڈھال کر پیش کر دیتے ہیں۔ کردار نگار قصہ اور کہانی کو دلچسپ اور مؤثر بنانے کے لیے کردار کو اپنی تخلیقی مہارت کے ذریعے جاندار، خوبصورت اور دلچسپ بناتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عمدہ تخیل، وسعت مطالعہ اور مشاہدہ کا حامل ہو۔ اصغر ندیم سیّد نے اسی باعث عمدہ کردار تخلیق کیے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں کرداروں کا انوکھا جہان نظر آتا ہے۔

وہ معاشرتی موضوعات کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے انسانی نفسیات کو پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے ڈرامہ نگار ہیں جو زندگی کی حقیقتوں کو خطرناک حد تک بیان کرنے کا فن جانتے ہیں۔ وہ عام موضوع کو بھی خاص بنا دیتے ہیں ان کے ڈراموں میں جو موضوعات پائے جاتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

اصغر ندیم سیّد ڈرامے میں کمال درجے کی مسحور کن فضا قائم کرتے ہوئے موضوعات کو بھی خاص رنگ و آہنگ میں ڈھال کر پیش کر دیتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے عام معاشرے کے مسائل کو موضوع بنا کر ڈرامہ بنائے۔ ان کا ڈرامہ "خدا زمین سے گیا نہیں ہے" میں دہشت گردی مرکزی موضوع ہے جس کے گرد ساری کہانی گردش ہے وہ دہشت گردوں کی ذہنیت اور ان کے اعمال و افعال ڈرامے کے ذریعے سامنے

لاتے ہیں۔

ہمیں دہشت گردی "تم ہو کہ چپ" میں بھی نظر آتی ہے۔ یہاں دہشت گردی پورے ملک میں نہیں ہے بلکہ ایک خاص طبقے پر نظر انداز ہوتی نظر آتی ہے۔ دہشت پھیلانے والا قبیلے کا سردار ہی ہے۔ جو اپنی دہشت اپنی رعایا پر برقرار رکھنے کے لیے نام نہاد روایات کی پاسداری کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی معصوم کی جان سے زیادہ قیمتی روایات اور اس کا حکم ہے۔ وہ بے گناہ کو تختہ دار پر لٹکاتا ہے تو اپنی بیوی کو زندہ قبر میں اتار دیتا ہے۔ ڈرامانگار اس موضوع کو بڑے عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

اصغر ندیم سید جاگیر دارانہ سماج، تمدن اور اس حوالے سے افراد کی عادات و خصائل اور سوچ کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں ہمیں جاگیر دارانہ نظام اور رسم و رواج کی واضح تصویر نظر آنے کے ساتھ ساتھ اس نظام کی ناہمواری اور منفی اثرات بھی نظر آتے ہیں نیز اس نظام کے تحت پسنے والے افراد کا حال سامنے آتا ہے۔ فرسودہ روایت کی پاسداری کرتے ہوئے ظلم و بربریت کی داستان رقم کی جاتی ہے۔ جاگیر داروں کے گھر کا ماحول، عورتوں کا حویلی میں نظر بند رہنا، ان پر لاگو نام نہاد رواج، کی مکمل تصویر کشی موجود ہے۔ ڈراموں میں عورتیں اس نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں۔

آپ اسی نظام کے تحت عورت کا استحصال بھی سامنے لاتے ہیں۔ عورت کے مسائل و مشکلات ان کے ڈراموں کا اہم موضوع رہا ہے۔ وہ اپنے ڈراموں کے ذریعے خواتین کو مسائل و مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ عورت کے مسائل کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کا مقصد عورت کو پیغام دینا اور اسے سنبھلنے کی تلقین کرنا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں غربت اور افلاس ایک اہم مسئلہ ہے، جس کا ذکر ہمارے ادب میں جابجا ملتا ہے۔ اصغر ندیم سیّد اپنے ڈراموں میں اس مسئلے کو سامنے لاتے ہیں۔ مجبور اور بے بس افراد جو غربت کی زندگی گزار رہے ہیں ان کی مشکلات کا ذکر کرتے ہیں۔ نیز وہ عام افراد جو جاگیر داروں کی چاکری کرنے پر مجبور ہیں کو موضوعِ ڈراما بناتے ہیں۔ ان کے کردار اپنے قول و عمل کے ذریعے موضوعات کو جگہ دیتے ہیں۔

کردار ڈراموں میں کلّی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں کرداروں کے باعث کہانی اختتام کو پہنچتی ہے۔ اگر کردار ہی نہ ہوں تو کہانی بھی نہیں ہو گی۔ اسی باعث ان کے ڈراموں میں کرداروں کا ایک جہاں آباد ہے۔ جن

کا تجزیہ ضروری ہے۔ ان کے ہاں ہمیں فرد کی داخلی نفسیات کا گہرا مشاہدہ ملتا ہے۔ اس لیے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کرنا از حد ضروری تھا۔ ان کے ڈراموں میں ہر طرح کے کردار سامنے آتے ہیں۔ بیمار ذہنیت کی عکاسی جاگیر دار کرتے ہیں تو دہشت گرد پست ذہنیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں مرد برتر درجہ رکھتا ہے، جبکہ عورت استحصال کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ پُر عزم بھی ہے۔ "خدا زمین سے گیا نہیں ہے" میں عورت جھکتی ہوئی بے کس نظر آتی ہے، تو "تم ہو کہ چپ"، "دل تو بھٹکے گا" اور "بول میری مچھلی" میں عورت لاشعور کی دبی ہوئی خواہشوں کو سامنے لاتی ہے اور خوابوں اور خواہشوں کے پیچھے بھاگنے والی اور ان کو پورا کرنے کے لیے ہر حد سے گزر جانے والی دکھائی دیتی ہے۔ ان ڈراموں میں کرداروں کا ایک انوکھا جہاں نظر آتا ہے جہاں سلجھے ہوئے افراد بھی ہیں تو دوسری طرف پست ذہنیت افراد بھی موجود ہیں۔ ان کے ڈراموں میں آزاد تلازمہ خیال، شعور، لاشعور، تحت الشعور کو کرداروں کے ذریعے بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

انسان کو اپنی زندگی بسر کرنے کیلے سماجی تعلقات کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ انسان اپنے وجود، پرورش، تعلیم، صحت الغرض زندگی کے تمام معاملات میں قدم بقدم اس کا محتاج رہتا ہے۔ انسان بطور سماجی رکن اپنے وجود کے فوراً بعد جس معاشرتی ادارے کا محتاج ہوتا ہے، وہ ادارہ "خاندان" کہلاتا ہے۔ جو انسان کی جسمانی، روحانی، اخلاقی اور فکری پرورش کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس ادارے میں زندگی گزارنے کے طور طریقوں کو عائلی نظام زندگی کہا جاتا ہے۔ عائلی زندگی ہی انسانی شخصیت کی پہلی بنیاد رکھتی ہے۔ اصغر ندیم سیّد اپنے ڈراموں میں ہر طرح کی گھریلو زندگی کو پیش کرتے ہیں۔

ان کے ڈراموں میں عائلی زندگی بے شمار مشکلات کا شکار ہے۔ "خدا زمین سے گیا نہیں ہے" اور تم ہو کہ چپ" پدر سری نظام خاندان کی نماءندگی کرتا ہے۔ جہاں مرد حاکم ہے اور گھر کے فیصلے اسی کے سپرد ہیں۔ رومانویت "تم ہو کہ چپ" میں تو دکھائی دیتی ہے مگر "خدا زمین سے گیا نہیں ہے" میں مفقود ہے۔ عزت و احترام اور پیار ہمیں ان گھرانوں میں نظر نہیں آتا۔ ان گھروں میں ایک ہیجان اور کشمکش کی کیفیت نظر آتی ہے۔

"بول میری مچھلی" اور "دل تو بھٹکے گا" میں جمہوری نظامِ خاندان دکھائی دیتا ہے۔ جس میں مرد اور

عورت دونوں مل کر گھر کا نظام چلاتے ہیں۔ مگر افرادِ خانہ اپنی خواہشوں کی تکمیل کرتے کرتے زندگی مشکل بنادیتے اور زندگی کو بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ ان ڈراموں کی عائلی زندگی میں رومانیت، احترام اور خلوص تو نظر آتا ہے مگر فریب کے باعث زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ جیسے حسن بانو اور مجاز صدیقی لالچ اور خود غرضی میں دوسروں کی زندگیاں برباد کر دیتے ہیں۔

انہوں نے ان ڈراموں کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ عہد میں انسانی روح کا اضطراب اور ذہنی و فکری انتشار شخصیت پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ڈرامانگار کرداروں کے ذریعے بتاتے ہیں کہ لاحاصل آرزو کے حصول کے لیے انسان ہمیشہ غلط راستوں کا انتخاب کرتا ہے۔ یہی غلط راستہ اس سے غلط اور صحیح کی تمیز بھی چھین لیتا ہے۔ وہ رباب اور مجاز صدیقی کا ناجائز تعلق اور یاسمین کا نفس کی تسکین کے لیے ایک ملازم کو ورغلانا اور حرام فعل کے مرتکب ہونے کی سخت مخالفت کرتے اور ان کے بدترین انجام کی واضح جھلک پیش کرتے ہیں۔ ان سب کی زندگیوں میں موجود بے چینی، تنہائی، فکری انتشار اور روحانی کرب ان کی عائلی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

ڈرامانگار اصغر ندیم سیّد کا مقصد ہمیں بتانا ہے کہ اخلاقی اور روحانی اقدار کو چھوڑ کر مادی اقدار اپنانے کا عمل خسارے کا باعث بنتا ہے۔ ان کے چاروں ڈراموں کے تحقیقی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاشرتی ماحول سے لگاؤ رکھتے ہیں اور انہوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے ماحول اور سماجی حالات کی مکمل عکاسی کی ہے۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں ہر طرح کا معاشرتی گروہ پیش کیا اور اس گروہ کا رہن سہن اور طور طریقے بھی منظرعام پر لائے ہیں۔

ان کے کردار اپنے ماحول کو شعوری اور لاشعوری طور پر اپنا کر اپنی فطرت کا حصہ بنالیتے ہیں مگر جب یہی افراد اپنے ماحول سے باہر نکلتے ہیں تو دوسرے ماحول سے مطابقت اختیار نہیں کر پاتے جس کی بنا پر ان کا دوسرے ماحول سے میل نہیں ہو پاتا۔ کہیں وہ صبر کر لیتے ہیں تو کہیں احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کی واضح مثال "تم ہو کہ چپ" کے نسوانی کردار ہیں۔ "مشل" جو مغربی ملک کی پروردہ ہے۔ وہ جب یہاں کے قبائلی علاقے میں آتی اور قید کر دی جاتی ہے، تو وہ ہذیانی ہو کر چیختی چلاتی اور احتجاج کرتی ہے۔ دوسری طرف بی بی جانم صبر کی چادر اوڑھ کر خاموش ہو جاتی ہے مگر اس کی پوری زندگی کی خاموشی اور صبر بھی اس کو بھیانک

موت سے بچا نہیں پاتا۔ سردار اس کو جرم کی پاداش میں زندہ درگور کر دیتا ہے۔ ان کے ڈراموں کے کرداروں میں مرد حاکم اور عورت محکوم ہے۔ وہ صرف حکم ماننے والی غلام ہے۔ وہ اپنے جاگیر دارانہ نظام کے ڈراموں کے ذریعے مرد کے ظلم کو واضح کرتے اور ایک ایسے گھٹیا نظام کا بھیانک چہرہ ہمارے سامنے لاتے ہیں جو آج بھی قبائلی علاقوں میں رائج ہے۔

ان کے ڈراموں میں مثبت کردار بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے کرداروں کی پختگی اور مثبت سوچ ڈرامے میں جان ڈال دیتی ہے۔ ڈراما نگار مستحکم اور اعلیٰ کردار کو ہمارے سامنے لا کر بتاتے ہیں کہ مثبت اخلاق انسان کو ہر مشکل سے نپٹنے کا حل تلاش کر دیتا ہے۔ "خدا زمیں سے گیا نہیں ہے" میں رحمان گل اور اس کے بیٹے کا کردار ایک مثبت کردار ہے۔ جن کی مثبت سوچ کے باعث کہانی میں تناؤ کم ہو جاتا ہے۔ یہ وہ کردار ہیں جس کی وجہ سے کہانی میں غم کے بجائے خوشی کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ انہیں کرداروں کے ہاں ہمیں عورت کی عزت اور حب الوطنی بھی دکھائی دیتی ہے۔ "بول میری مچھلی" میں پروفیسر وحید کا کردار ایک سیدھے سادھے شخص کا کردار ہے جسے ہم ایک مثبت کردار بھی کہہ سکتے ہیں۔

اصغر ندیم سیّد کے ہاں ہر طرح کا کردار ملتا ہے۔ منفی مثبت جامد متحرک کردار جن سے ڈراما مزید خوبصورت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ضمنی کرداروں کو بھی مقصدیت کا اذّن دے کر کہانی میں پیش کرتے ہیں۔ "دل تو بھٹکے گا" کا ملازم **جان** جس کو کہانی کا مرکزی کردار اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے مگر اس کو مالک اتنی بے دردی سے مارتے پیٹتے ہے کہ وہ بے بسی میں صرف یہی بولتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ بیر بل اپنی محبوبہ کے فراق میں حویلی کا ملازم بن جاتا ہے۔ مگر ظالم لوگ اس کو بھی جان سے مار دیتے ہے۔ ان کے ضمنی کردار بے بسی دکھ کی علامت بنے ہوئے سامنے آتے ہے۔

کسی بھی لکھاری، خاص طور سے ڈراما نگار کے لیے یہ بات بہت مشکل ہوتی ہے کہ وہ کسی کی خوشی، دکھ، کسک یا سینے میں اٹھتی ہوئی ٹیس کو اپنا جزو جسم و جاں بنالے۔ جب تک کوئی لکھاری یا شاعر کسی دوسرے کی خوشی و غم کو اپنی روح کی گہرائیوں تک محسوس نہیں گا اس وقت تک یہ ممکن نہیں کہ وہ اس کی ترجمانی اس طرح کر سکے کہ لوگ یہ بات کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ اس نے غم و خوشی کا حق ادا کر دیا ہے۔ کوئی حادثہ ہو یا سانحہ، لازمی ہے کہ وہ لکھنے والے کے پور پور اور روئیں روئیں میں سرایت کر جائے تب ہی کہیں جا کے وہ

لفظوں کو اپنا صحیح ترجمان بنا سکتا ہے۔ اصغر ندیم سیّد نے بڑے عمدہ انداز میں ہر واقعے اور سانحے کو پیش کیا ہے۔

عائلی نظامِ قانون سے انحراف کرتا ہوا خاندان ہو یا مکمل باضابطہ عائلی نظامِ زندگی گزارتا ہوا خاندان، ان کے ڈراموں میں سب کی واضح تصویر نظر آتی ہے۔ ان کے ڈراموں میں عائلی زندگی کے حوالے سے لڑکیوں کے مسائل، ان کی تعلیم و تربیت، عورتوں کی معاشی اور فکری آزادی، خواتین کے حقوق، معاشرتی نا انصافی، طبقاتی فرق کے نتیجے میں کمزور طبقوں کے استحصال کے خلاف مردانہ معاشرے کے مختلف خدوخال ان کے موضوعات رہے ہیں۔

خود افادیت اور ایثار کے مابین توازن کا سوال اہم ترین ہے۔ ان دونوں کے درمیان توازن ہی اصل میں زندگی کا حق ہے۔ اس کے بغیر زندگی خوشگوار، مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتی۔ مگر آج کے اس روشن خیال دور میں قدیم عادات کو فرسودہ کر کے ٹھکرایا جا رہا ہے۔ جس کے باعث زندگی میں توازن ناممکن تصور کیا جاتا ہے۔ جیسے جیسے تہذیب آگے بڑھتی جا رہی ہے، وہ حالات جنھوں نے پہلے زمانے میں عائلی زندگی کو سماج کا لازمی محافظ بنا رکھا تھا، اپنی اہمیت کھو رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ پولیس اور عدالت نہ تھی، جرائم اور برائیوں سے بچانے والی ایک ہی کامیاب ہستی ہوتی تھی اور وہ ہستی عائلی زندگی میں خاندانی بزرگ یا سردار عائلہ کی ہوتی تھی۔ سردار عائلہ اپنے افراد خاندان کو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے سے روکتا تھا اور دوسروں کی شاطرانہ چالوں سے ان کو محفوظ رکھتا تھا۔ اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آجاتا تو خود اس کی مناسب سزا متعین کرتا اور اسے نافذ کر دیتا تھا۔ مگر آج کل جدید زمانے میں حالات ایسے بدل گئے ہیں کہ یہ چیزیں تقریباً ختم ہو گئیں۔

پہلے ماں باپ، بچے عام طور پر ایک ہی جگہ زندگی بسر کرتے تھے اور اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ قریبی تعلق رکھتے تھے۔ لیکن موجودہ زمانے میں ضروریات و حالات نے اس صورت حال کو ختم کر دیا ہے۔ تعلیمی، معاشی اور تربیتی ضروریات ایک ہی گھرانے کے افراد کو اکثر مختلف سمتوں میں بکھیر دیتی ہیں اور عائلی زندگی کے روابط قائم نہیں رہتے۔

اصغر ندیم سیّد کو جس طرح اپنے ڈراموں میں جذبات یا کسی واقعے کی منظر کشی کے لیے الفاظ کے چناؤ اور ان چنے ہوئے الفاظ کی مدد سے واقعات کی اٹھان میں ایک کمال حاصل ہے اسی طرح منظر کے ایک

ایک مکالمے میں وہ اس بات کا پورا خیال رکھتے ہیں کہ ہر لفظ مضمون کے اٹھان سے مطابقت رکھتا ہو اور ناظر جب جب بھی اس کو دیکھے، سارے الفاظ اس کی روح تک اتر جائیں۔ ان کے ڈرامے ہمیں معاشرتی و سماجی زندگی کے قریب ترین دکھائی دیتے ہیں۔ عائلی زندگی میں پیار، محبت، اعتبار وفا، حسد، نفرت، دھوکا غرض ہر طرح کا موضوع ملتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے مثبت اور منفی جذبات کو ابھارتے ہیں "تم ہو کہ چپ" اور " خدا زمیں سے گیا نہیں ہے" میں پدرسری نظامِ خاندان نظر آتا ہے جبکہ "بول میری مچھلی" اور "دل تو بھٹکے گا" میں جمہوری نظامِ خاندان کو پیش کرتے ہیں۔

ان کے کردار خالص معاشرتی کردار ہیں۔ جن کی عادتوں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ انہی عادتوں کے تضاد کے باعث ڈرامے کا حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ کہیں مرد عورت کی عزت کرتا دکھائی دیتا ہے تو کہیں مرد عورت کی پامالی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ گھریلو ماحول میں ایک کشمکش تضاد کی کیفیت برقرار رہتی ہے، جس سے کہانی میں تجسس کو اور بڑھاوا دیا جاتا ہے۔ مرد انّا اور طاقت کے بل بوتے پر سب کچھ حاصل کرتا ہے جب کہ عورت اپنی کم عقلی کے باعث سب کچھ گنوا دیتی ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مشل کا کردار ہو یا رباب، سحاب کا کردار ہو ہمیں نسوانی کردار جھکتے گرتے سنبھلتے اور برباد ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

آج کے ڈراموں کا مزاج کمرشل ہے اور وہ صرف ایک محدود طبقے کی خواتین کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ پورے معاشرے کی نہ تو ترجمانی کرتے ہیں نہ ہی ان کو معاشرے کے ہر فرد کی طرف سے پذیرائی حاصل ہے۔ چند موضوعات جن میں لڑکیوں کے رشتوں کی درمیانے طبقے میں اہمیت ہی کو عورتوں کے حقیقی مسائل سمجھ لیا گیا ہے۔ جب کہ آج کی لڑکیوں کی اکثریت کا مسئلہ شادی کے بجائے تعلیم اور ملازمت ہے۔ تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں۔ پہلے ڈراموں میں پورا سماج اور پورا خاندان دکھایا جاتا تھا۔ جسے ہر طبقہ آسانی سے سمجھ لیتا تھا اور دلچسپی لیتا تھا۔ اصغر ندیم سید کے ڈراموں کا مزاج پہلے اور موجودہ حالات و واقعات کا حسین امتزاج ہے۔ وہ روایت سے انحراف نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے ڈراموں میں جگہ دیتے ہیں۔ وہ موجودہ رسوم ورواج کو بھی اپنے ڈراموں کا موضوع بناتے ہیں۔

عورت کی محبت کو وہ ایک زبردست انقلابی قوت خیال کرتے ہیں جو مرد کی زندگی کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ ان کے کرداروں کے نوجوان روایت اور فرسودہ نظام سے بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈراما نگار ایسے

کرداروں کی نفسیات کو ان کے افعال کے ذریعے سامنے لاتے ہیں۔ وہ ان کی احساسِ محرومی کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ رومانویت اور نفسیات کے پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے تلخیاں اور ناآسودگیاں بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق بتاتے ہوئے جاگیر دارانہ نظام کو بھی اپنے فکر و فن کا محور بناتے ہیں۔

زندگی سے گہرے تعلق کی وجہ سے ان کے ڈرامے فنی اور فکری رفعتوں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں داخلی اور خارجی حقیقت نگاری کا رجحان عروج پر نظر آتا ہے۔ جس سے وہ جزبات کی پیشکش بہت عمدگی سے کرتے ہیں۔ ڈراما نگار عورت کے خلوص و ایثار کے قائل ہیں۔ عورت کو وہ مضبوط مانتے ہیں، خواہ اس کا زندگی میں کوئی بھی مقام ہو۔ لیکن وہ چند کرداروں کے ذریعے بتاتے ہیں کہ عورت کی زندگی مرد کے بغیر ادھوری ہے۔

اصغر ندیم سیّد لڑکیوں کو پیغام دیتے ہیں کہ مادی چیزوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیں۔ ان چیزوں کی طلب ان کو صرف خسارے میں ڈال دے گی۔ رباب، سحاب، ماہین اور صوفیہ ان کرداروں میں پیسے کی ہوس اور مادیت پرستی دکھائی گئی ہے۔ ان تینوں نے مصنوعی چمک دمک کو سونا سمجھ کر اپنا سب کچھ قربان کر دیا یہاں تک کہ وہ دنیا کی خواہش کرتی ہوئی اپنی عزت تک نیلام کر دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک محبت کے خالص جذبے ناپید ہیں۔ وہ محبت کے جذبوں کو نہیں بلکہ ہوس کو سامنے لاتے ہیں۔ وہ ان مردوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جو عورت کو ٹشو پیپر سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ اسی باعث نفسیاتی امراض، شکستہ خاندان، منشیات کے استعمال اور ناجائز تعلقات کا گراف بڑھتا چلا جارہا ہے۔ چنانچہ اصغر ندیم سیّد حقیقی تعلق کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ اصل تعلق میاں بیوی کا جائز رشتہ ہی ہے۔ ناجائز تعلق بے معنی ہے جو صرف انسان کو خسارے میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ان کے ڈرامے ہر طبقے میں مقبول ہیں۔ اسی باعث ان کے ڈراموں میں ہر طبقے کے افراد کے لیے واضح پیغام دکھائی دیتا ہے۔

مجموعی طور پر اصغر ندیم سید کی فکر کا احاطہ کیا جائے تو ان کے ہاں ایک بڑے لکھاری کی طرح زندگی اور معاشرے کے کرداروں پر غور و فکر کی کیفیت ملتی ہے۔ ان کے ہاں تلاش کا سفر بھی موجود ہے اور زندگی کی پنہاں حقیقتیں بھی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے فکری اور قلبی تجربے سے کچھ نتائج اخذ کرتے ہیں اور ان کو اپنے ڈراموں میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں احساسِ ذمہ داری کی کیفیت ملتی ہے۔ وہ اس بات کے معترف

ہیں کہ آج بھی لوگ اچھا لکھنا دیکھنا چاہتے ہیں، اسی لیے وہ بھی اچھا پیش کرتے ہیں۔ آج کے نئے لکھنے والے ان کی تقلید میں اچھا لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ ایک باشعور اور سنجیدہ ڈراما نگار ہیں، ملک کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی و تاریخی پہلوؤں پر ان کی گہری نظر ہے، ساتھ ہی فن و تکنیک کے قدیم وجدید اصولوں پر بھی ان کی گرفت مضبوط ہے۔ فن اور فکر کے حسین امتزاج سے انھوں نے کئی ڈرامے تخلیق کیے اور اردو ادب و فن میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے جو بھی ڈرامے لکھے جدید و قدیم فن واصول اور ہیئت و تکنیک کی آگہی اور ٹیلی ویژن ڈرامے کے لوازمات کو مد نظر رکھ کر لکھے اور یہی نہیں بلکہ اپنے یہاں کی روایت سے پوری واقفیت کا ثبوت بھی فراہم کیا۔ عصری سماجی و تہذیبی عناصر کی شکست وریخت کو ہر ممکن پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے سامعین وناظرین کو مافوق الفطرت عناصر کی خواب آور گولی دینے کے بجائے عصری تقاضوں اور حقائقِ حیات سے آنکھیں چار کرنا سکھایا۔ محبت، اخوت، انسان دوستی اور انسانیت کے فروغ میں مددگار قدروں کو اپنے ڈراموں میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ معاشرے اور سماج کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ لہٰذا ان کے سماجی ڈرامے ہوں یا تہذیبی ڈرامے سب میں مذکورہ عناصر کو اولیت حاصل ہے۔

ب۔ نتائج:

ا۔ اصغر ندیم سیّد کے ڈراموں میں جو موضوعات پائے جاتے ہیں وہ اپنی معنویت میں کمال درجے کی مسحور کن فضا قائم کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات کا تعلق معاشرے کے مختلف طبقوں سے ہے۔ وہ برائیوں کو موضوعات کی وجہ سے بے نقاب کرتے ہے۔

۲۔ ان کے ڈراموں میں نفسیات کے زیرِ اثر شعور، لاشعور، شعور کی رو، احساسِ کمتری، عورتوں اور مردوں کی نفسیات، جزباتی گھٹن، تحت الشعور جیسے موضوعات کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ نفسیاتی کیفیات کے اظہار کے حوالے سے ڈراموں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

۳۔ عائلی مسائل بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں گھریلو ماحول دن بہ دن ان مسائل کی لپیٹ میں آکر حقیقی مقاصد کے حصول میں ناکام ہوتا جارہاہے۔ اصغر ندیم سیّد ان مسائل کا سبب، قبائلی اور علاقائی رسم ورواج کے اثرات، افراد کے باہمی رویے اور مختلف خاندانوں کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

ج۔ سفارشات:

1۔ اصغر ندیم سیّد کے ڈراموں پر الگ تانیثی موضوع پر تحقیقی کام کیا جاسکتاہے۔

2۔ ان کے ڈراموں کا فنی تجزیہ بھی لگ تحقیق کا متقاضی ہے۔

3۔ ان کے ڈراموں کے علاوہ اصغر ندیم سیّد کے ناولٹ اور سفر نامے پر بھی ایم-فل کی سطح کا تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

کتابیات

الف۔بنیادی مآخذ

غیر مطبوعہ:

ڈرامے

ا۔خدا زمیں سے گیا نہیں ہے، سکرپٹ ۲۰۰۹ء

www.humtv.com

www.youtube.com

۲۔بول میری مچھلی، سکرپٹ ۲۰۰۹ء

Www.geotv.com

www.youtube.com

۳۔تم ہو کہ چُپ ، سکرپٹ ۲۰۱۱ء

Www.geotv.com

www.youtube.com

۴۔دل تو بھٹکے گا، سکرپٹ ۲۰۱۲ء

www.geotv.com

www.youtube.com

ب۔ثانوی مآخذ

کتب:

ابوالکلام آزاد، مسلمان عورت، مکتبہ اشاعت القرآن، دہلی، ۱۹۶۳ء

اعجاز حسین، ڈاکٹر، ادبی کارنامے، کارواں پبلیشرز، آلہ آباد، ۱۹۶۵ء
اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، طرزِ احساس، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور ۱۹۸۸ء
اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، آدھے چاند کی رات، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۳ء
اصغر ندیم سیّد، پروفیسر، ادھوری کلیات، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء
انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پسِ منظر، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۱ء
حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، اشاعتِ اوّل، مئی ۲۰۱۵ء
خالد سہیل، انفرادی و معاشرتی نفسیات، سنگِ میل پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء
دیوندر اسر، ادب اور نفسیات، مکتبہ شاہراہ دہلی، ۱۹۶۳ء
رشید امجد ڈاکٹر، ترتیب و تعارف، پاکستانی ادب ڈرامہ، چھٹی جلد، حصہ اول، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی ۱۹۸۶ء
ریاض محمد اکبر، نوجوانوں کی نفسیات، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۴۹ء
سیّد احمد عروج قادری، اسلام کے عائلی قوانین، مرکزی مکتبہ، اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء
سیّد بادشاہ حسین، اردو میں ڈرامانگاری، شمس المطابع، حیدر آباد، ۱۹۳۵ء
سیّد محمد حسن رضوی، مرتب، ڈرامے پر ایک دقیق نظر، در مطبع مقیدم، آگرہ، ۱۹۰۴ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، تین بڑے نفسیات دان، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۱۹۹۹ء
شکیل الرحمٰن، ادب اور نفسیات، اشاعت گھر پٹنہ، ۱۹۵۱ء
شمشاد حسین، پروفیسر، مترجم، ذکیہ مشہدی، انسانی کردار: ایک نفسیاتی اور معاشرتی تجزیہ، انجمنِ ترقی خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء
شہزاد احمد، فرائیڈ کی نفسیات دو دور، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۱۹۹۹ء
ظہور الدین ڈاکٹر، جدید اردو ڈراما، ادارہ فکر جدید، کوچۂ روہیلا دریا گنج، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء
عشرت رحمانی، ڈاکٹر، اردو ڈرامے کا ارتقا، علی گڑھ بک ڈپو، علی گڑھ ہند، ۱۹۷۸ء
فرغانہ، ڈاکٹر، اردو ڈراما آزادی سے قبل، ڈراکٹر فرغانہ پبلی شرز، جے پور روڈ، راجھستان ۲۰۰۶ء
فصیح احمد صدیقی، پروفیسر، اردو یک بابی ڈراما (تکنیک، تمثیل)، ادارہ ادب اردو، بمبئی، ۱۹۷۳ء

مبارک علی ڈاکٹر، جاگیر داری، تاریخ پبلی کیشنز، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء

مبارک علی، ڈاکٹر، اکبر کا ہندوستان، تاریخ پبلی کیشنز، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء

محمد تاتار خان، اردو ڈرامے، ابراہیم یوسف، محمد تاتار خان، پبلیشرز حیدر آباد، ۱۹۸۸ء

محمد شاہد حسین، عوامی روایات اور اردو ڈراما، حسین پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

منیر احمد، مرتب، پاکستان ٹیلی ویژن کے ۲۵ سال میڈیا ہوم، اسلام آباد ۱۹۹۰ء

مہناز انور، ڈاکٹر، اردو ووافسانے کا تنقیدی مطالعہ، نصرت نامی، پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء

نعمان صدیقی، ڈاکٹر، مغلوں کا نظامِ مالگدازی، ترقی اردو بورڈ، ہندِ ۱۹۷۷ء

رسائل وجرائد:

سائبان، پندرہ روزہ، لاہور، اصغر ندیم سیّد

روزنامہ ایکسپریس لاہور صفحہ، شخصیت، ۱۴ جولائی ۲۰۱۰ء

روزنامہ جنگ سنڈے میگزین، آغا ناصر کی یاداشتیں، ۱۸، جوون، ۲۰۰۲ء

National news, daily times, February,2013

Dawn images, 17th feb,1995

Focus, Magazine, Sajed Aslam, November,12,1994

The Nation, Midweek, hina Saeed, September,15,1993

انٹرویو

اصغر ندیم سیّد، انٹرویو از صبا وحید، لاہور، ۱۲ نومبر، ۲۰۱۸ء، بوقت: شام ۵ بجے

WEBSITES

www.geotv.com/Drama.

www.youtube.com

www.humtv.com .

.www.dailymotion. /xsnick

. www.youtube.com/rekhta

.www.express.pk/story/

.Newageislam.com/shariah-law-in-the-light-of-Quran

.www.wikipedia.com